بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد نمبر ۷۹　ماہ نومبر ۲۰۱۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ　شمارہ نمبر ۱۱

مدیر
خلیل الرحمان سجاد نعمانی
E-mail : ilm.zikr@yahoo.com

اس شمارہ میں

	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	نگاہ اولیں	مدیر	۳
۲	حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک خاص نظریہ	حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ	۹
۳	کیا ہم مرنے کے لئے تیار ہیں	حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی	۲۶
۴	ذبح عظیم	جناب قطب الدین ملا صاحب	۴۳
۵	ترکہ کی شرعی تقسیم ایک انتہائی اہم فریضہ	مولانا مفتی آصف انجم ملی ندوی	۴۹

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ
آپ کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ
بصیغہ V.P. ارسال کیا جائے گا جس میں آپ کے -/35 روپے زائد خرچ ہوں گے — منیجر

ضروری اعلان

درج ذیل مقامات میں الفرقان کی توسیع اشاعت کی ذمہ داری جن حضرات نے قبول کی ہے ان کے نام اور فون نمبر نیچے لکھے جا رہے ہیں۔ ان مقامات اور قرب وجوار کے حضرات اُن سے رابطہ قائم کریں۔

مقام	نام	فون نمبر
۱- اورنگ آباد	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	(0)9423456752
۲- مالیگاؤں	مولانا حسنین محفوظ	(0)9226876589
۳- بیلگام	مولانا تنویر صاحب	(0)9880482120
۴- بارہ مولا (جموں کشمیر)	سجاد المجید	(0)9906428932
۵- بڑودہ (گجرات)	مفتی محمد سلمان صاحب	(0)9898610513

مرتب: یحییٰ نعمانی

ناظم شعبۂ رابطہ عامہ : بلال سجاد نعمانی
E-mail: nomani_sajjadbilal@yahoo.com

☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان — عمومی 180 روپے
☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان — خصوصی خریداران 400 روپے
☆ سالانہ چندہ برائے ہندوستان (وی پی سادہ) 210 روپے
☆ سالانہ چندہ برائے پاکستان، پاکستان میں -/1200 ہندوستان میں -/750 روپے
☆ بیرونی ممالک بذریعہ ہوائی جہاز -/20 پاؤنڈ -/40 ڈالر خصوصی خریداران -/£30

لائف ممبر شپ فیس: ہندوستان -/5000 روپے، بیرونی ممالک 500 پاؤنڈ 1000 ڈالر

برطانیہ میں ترسیل زر کا پتہ: Mr. RAZIUR RAHMAN 90-B HANLEY ROAD, LONDON N4 3DW (U.K) ,Fax & Phone : 020 72721382

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: ادارہ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور۔ (فون: 7663896 - 7855012)

ادارہ کا مضمون نگار کی فکر سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ الفرقان 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 226018

فون نمبر: (0522)4079758 e-mail : alfurqan_lko@yahoo.com

خلیل الرحمٰن سجاد کے لئے پرنٹر پبلشر محمد حسان نعمانی نے کاکوری آفسٹ پریس پکچری روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۱۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نگاہ اولیں

——— مدیر

گذشتہ ماہ ۲۳/ ستمبر کو فلسطینی صدر محمود عباس نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بانکی مون سے ملاقات کر کے انہیں ایک عرض داشت پیش کی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سیکوریٹی کونسل کا اجلاس بلا کر فلسطینی ریاست کو تسلیم کیا جائے، اور اسے اقوام متحدہ کی مکمل رکنیت دی جائے ——— اسرائیل اِس اقدام کی سخت مخالفت کر رہا ہے۔ اور امریکہ نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس معاملے کو سیکوریٹی کونسل تک پہنچنے نہیں دے گا اور اس کے لئے ضرورت پڑی تو اپنے ویٹو کے حق کا استعمال کرے گا۔ امریکہ اور اسرائیل کے رویّہ پر کسے حیرت ہے؟ تاہم یہ سوال بہت سے ذہنوں میں ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ حالات میں ایسی کیا تبدیلی آئی کہ خود محمود عباس اور ان کی تنظیم یہ قدم اٹھانے پر راضی ہو گئے۔ جو لوگ ان کے افکار اور تاریخ سے واقف ہیں، خاص طور اُن کے ذہن میں یقیناً یہ سوال گردش کر رہا ہوگا۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اُن تفصیلی حالات سے ہمیں واقفیت حاصل ہے جن کی وجہ سے فلسطین کی موجودہ قیادت یہ قدم اٹھانے پر آمادہ یا مجبور ہوئی ہے۔ البتہ کچھ قرائن سے صورت حال کا جو اجمالی اندازہ ہو رہا ہے، اس کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کرتے ہیں۔

پورے عالم عرب کے عوام میں، خصوصاً نوجوانوں میں، دیکھتے ہی دیکھتے حالات کو یکسر بدل ڈالنے کا ایک زبردست جذبہ بیدار ہو گیا ہے، وہ ہر قیمت پر نظام کو بدل ڈالنا چاہتے ہیں، آمریت اور استبداد کا جو ہوّا ان کے ذہنوں پر عرصہ سے سوار تھا، اس سے وہ اب آزاد ہو گئے ہیں۔

اس انقلابی لہر نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب'' کے مصداق نئی نسل کے زیادہ تر لوگ صرف اپنے ہی حکام کے خلاف نہیں بلکہ مغرب کی غلامی کے خلاف بھی اٹھ کھڑے

ہوئے ہیں، وہ اگر اپنے ملکوں کی آمریت اور استبداد کو رد کرنے کے لئے سڑکوں پر اترے ہیں تو امریکہ کی استبدادی سیاست کو رد کرنا بھی ان کا ایک اہم مقصد ہے۔ قرائن یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ذاتی مفاد کی سیاست، اور اقتدار پر چند خاندانوں یا ایک خاندان کی اجارہ داری کا دور اب رخصت ہو رہا ہے ——

حالات کا ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ عوام اور بالخصوص نوجوانوں کا شعور بیدار ہو رہا ہے، انھیں چند انعامات کے کھلونے دے کر بہت دِن تک خاموش نہیں کیا جا سکتا —— اس انقلابی لہر کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نظریاتی تقسیم کے مسئلے کو اولیت نہیں دی جا رہی ہے۔ بلکہ عام حقوق اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کے مسائل سرفہرست ہیں۔ ایک سیکولر شخص ہو، یا دینی قدروں سے وابستہ انسان، کسان ہو یا ڈاکٹر، مزدور ہو یا طالب علم، وہ ان حقوق کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے جو ابھی تک مخصوص طبقہ تک محدود تھے۔ وہ تعلیم ہو، روزگار ہو، مہنگائی ہو، ذاتی تحفظ ہو، صحت ہو یا اظہار رائے کا حق، امن عامہ اور جان و مال اور عزت و آبرو کی سلامتی کا مسئلہ ہو یا شفاف انصاف کا مسئلہ ہو، ان تمام حقوق کے لئے ہر طبقۂ خیال کے افراد متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

اس انقلابی لہر کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اسلام پسند طبقہ بھی ایک ایسی حکمت عملی اپنانے کی کوشش کر رہا ہے جس کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے سکے، وہ الفاظ اور تعبیرات بھی وہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مقاصد شریعت سے اور اسلام کی حقیقی روح اور اسپرٹ سے سو فیصد ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لئے بھی کشش رکھتی ہیں جو ابھی شرعی تعبیرات اور عنوانات سے مانوس نہیں ہیں، اگرچہ وہ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ان ہی مقاصد کے لئے زیادہ تر کوشاں رہتے ہوں جن کا حصول اسلامی شریعت کے قوانین کا ایک اہم ہدف ہے —— اور اس سب کی وجہ سے ماحول ایسا بن رہا ہے کہ سیکولر اور لادین عناصر کو معاشرے کی مجموعی لہر سے الگ تھلگ پڑ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگا ہے۔ اور برسوں سے اقتدار پر قابض لوگ بھی آنے والے دنوں میں اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ عالم عرب کے عوام بالخصوص نوجوان جہاں اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، وہیں مسئلۂ فلسطین کے ساتھ ان حکام کے منافقانہ اور دوغلے رویہ سے وہ بھی سخت ناراض ہیں اور ان کے دلوں میں اس سلسلہ میں بھی

زبردست جذبات ابل رہے ہیں، اس امر کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ سعودی حکومت کی طرف سے بھی فلسطینی ریاست کے اقوام متحدہ کے ذریعہ تسلیم کئے جانے کے مذکورہ بالا مسئلہ کے متعلق امریکی پالیسی پر کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا ہے جن کی توقع عام حالات میں نہیں کی جاسکتی تھی۔ ترکی الفیصل سعودی شاہی خاندان کے ایک اہم فرد ہیں، وہ سعودی انٹیلی جینس کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں اور امریکہ میں سعودی سفیر کے منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ انھوں نے نیویارک ٹائمز میں اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے Veto a state, lose on ally ''ایک اسٹیٹ کو ویٹو کرنے سے آپ اپنا ایک حلیف کھودیں گے'' اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

'' The Obama administration has ample opportunities to lead Israelis and palestinians into bilateral peace talks, but American policy makers have unfortunately been more preoccupied with a deteriorating domestic economy and a paralyzed political scene than with finding a workable solution to this epic injustice.

Because Washington has offered no viable new proposals,the least it can do is step aside and not hinder Saudi, European and moderate Arab efforts to advance Palestinian rights at the Unitad Nations," adding that" Saudi Arabia would no longer be able to cooperate with America in the same way it historically has...Saudi leaders would be forced by domestic and regional pressures to adopt a far more independent and assertive foreign policy. like our recent military support for Bahrain's monarchy, which America opposed, Saudi Arabia would pursue other policies at odds with those of

the UnitedStates, including opposing the government of Prime Minister Nuri al-Maliki in Iraq and refusing to open an embassy there despite American pressure to do so. the Saudi government might part ways with Washington in Afghanistan and Yemen as well."

ترجمہ:

اوباما انتظامیہ کے پاس اسرائیلیوں اور فسلطینیوں کو دوطرفہ امن مذاکرات کی میز پر بیٹھانے کے کافی مواقع تھے، لیکن بدقسمتی سے امریکی پالیسی ساز اس شدید ناانصافی کو دور کرنے کی بہ نسبت گرتی ہوئی داخلی معیشت اور ایک مفلوج سیاسی منظرنامے کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ چونکہ امریکہ نے خود قابل عمل تجویزیں نہیں پیش کی ہیں، اس لئے کم سے کم وہ یہ تو کر ہی سکتا ہے کہ الگ ہٹ جائے اور اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے حقوق کے سلسلے میں سعودی، یورپین اور اعتدال پسند عربوں کی کوششوں میں رکاوٹ نہ ڈالے۔''

فاضل مضمون نگار نے مزید لکھا ہے کہ:

''سعودی عرب، آنے والے دنوں میں امریکہ کے ساتھ اس طرح کا تعاون نہیں کر سکے گا جیسا کہ وہ اب تک کرتا رہا ہے۔ سعودی رہنما داخلی اور علاقائی دباؤ کی وجہ سے کہیں زیادہ آزاد اور مؤثر خارجہ پالیسی اپنانے پر مجبور ہوں گے۔ ابھی حال ہی میں امریکہ کی مخالفت کے باوجود جس طرح ہم نے اپنی فوجیں بھیج کر بحرین کی شاہی حکومت کی مدد کی، اور عراق میں وزیر اعظم نوری المالکی کی حکومت کی ہم نے جس طرح مخالفت کی اور امریکی دباؤ کے باوجود ہم وہاں سفارت خانے کھولنے سے انکار کی پالیسی پر جس طرح قائم رہے یہ سب مذکورہ بالا اعلان کی مثالیں ہیں —— سعودی حکومت افغانستان اور یمن میں بھی واشنگٹن سے الگ رائے اختیار کر سکتی ہے۔''

یہ صحیح ہے کہ ترکی الفیصل اس وقت سعودی عرب میں کسی سرکاری عہدہ پر نہیں ہیں، لیکن یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ وہ اتنے وثوق اور صراحت کے ساتھ یہ باتیں حکومت کے موجودہ رجحان کے بالکل برعکس یا اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے کہہ رہے ہوں۔ علاوہ ازیں سعودی حکومت کے ایک سابق مشیر نوّاف

عبید نے بھی اپنے ایک مضمون میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، انھوں نے لکھا ہے:

For more than 60 years, Saudi Arabia has been bound '' by an unwritten bargain: oil for security. Riyadh has often protested but ultimately acquiesced to what it saw as misguided U.S. policies. But American missteps in the region since Sept. 11,an ill-conceived response to the Arab protest movements and an unconscionable refusal to hold Israel accountable for its illegal settlement building have brought this arrangement to an end. As the Saudis recalibrate the partnership, Riyadh intends to pursue a much more assertive foreign policy, at times conflicting with American interests."

ترجمہ:

۶۰ سال سے زیادہ عرصہ سے سعودی عرب ایک غیر تحریری معاہدے کی پابندی کرتا رہا اور وہ ہے ''سلامتی کے بدلے تیل''، ریاض نے ماضی میں کئی بار احتجاج تو کئے، مگر بالآخر وہ امریکہ کی ان پالیسیوں پر راضی ہوگیا جو اس کے خیال میں غلط مشوروں پر مبنی تھیں۔ لیکن نائن الیون کے بعد سے خطے میں امریکہ کے غلط اقدامات، عالم عرب میں احتجاجی لہروں پر امریکہ کے غلط ردعمل اور فلسطین کی آراضی پر اسرائیل کے نوآبادیاتی پروگرام کو روکنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے مسلسل انکار کے رویہ کی وجہ سے اب اس معاہدے پر عمل درآمد جاری رکھنا ممکن نہیں رہا ——— سعودی عوام اس اشتراک کی تنظیم نو چاہتے ہیں، اس لئے ریاض نے یہ طے کیا ہے کہ وہ ایسی خارجہ پالیسی اپنائے گا جو زیادہ مؤثر ہوگی، اور جو بسا اوقات امریکی مفادات کے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔

اب جب کہ سعودی حکومت کے رویہ میں کچھ تبدیلی کے آثار کا تذکرہ چھڑ ہی گیا ہے، تو یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس کی ایک بڑی وجہ فلسطین، لبنان، عراق، یمن اور بحرین اور خود سعودی

عرب میں ایران کی طرف سے جاری مسلسل ریشہ دوانیاں بھی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شاہد اب جا کر سعودی حکام اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ نیوکلیر بم کے نام پر نورا کشتی اور اسرائیل کے خلاف ایران کے مصنوعی شور شرابے کی آڑ میں امریکہ کا بھرپور تعاون ایران کو حاصل ہے۔

بہر حال سبب عوامی دباؤ ہو، خطے میں ایران کے عزائم ہوں، یا ترک قیادت کی بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت ہو، یا اور کچھ ہو، ہم سعودی حکومت کے طرز فکر میں اِس تبدیلی کا، اگر وہ واقعی موجود ہو، تو خیر مقدم کرتے ہیں—اور امید کرتے ہیں کہ وہ اب بلا مزید تاخیر کے، عزم و دانش مندی کے ساتھ اس راستے پر ثابت قدم رہیں گے بلکہ آگے بڑھتے رہیں گے۔ اللہ ان کو ہمت وحوصلہ عطا فرمائے، اور ان کا حامی و ناصر ہو۔

سعودی عرب کا تذکرہ تو اس مضمون میں ضمناً آ گیا، ورنہ گفتگو تو چل رہی تھی فلسطینی انتظامیہ کے رویہ میں تبدیلی کے بارے میں، اور ذکر تھا اس عوامی بیداری کا جو اس وقت پورے عالم عرب میں چل رہی ہے۔ سعودی عرب کے حالات کے تذکرہ سے امید ہے کہ یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہوگی کہ بظاہر فلسطینی انتظامیہ کے طرز عمل میں تبدیلی کا سبب بھی اسی عوامی لہر کا دباؤ ہے۔ یہ بات سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں کہ جس عوامی لہر کے اثر سے سعودی حکمراں اپنی موروثی پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرنے لگیں، اسے فلسطینی انتظامیہ کیسے نظر انداز کر سکتی ہے؟؟

اور یہ تو بس ظاہری سطح پر نظر آنے والے اسباب ہیں، اصل سبب تو ہر وجود میں آنے والی شے کا، اس قادر مطلق کا ارادہ اور اس کی مشیت ہے جس کے سوا کسی کا ارادہ ذاتی اور حقیقی نہیں ہوتا، وما تشاء ون الّا اَن یشاء اللہ! ''تم کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتے مگر تب جب کہ اللہ اس کا ارادہ کر لے''——عالم عرب میں جس عوامی لہر کا تذکرہ سطور بالا میں ہم نے کیا ہے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ لہر دراصل اس کی پکار اور کوشش کا نتیجہ ہے——اس لہر کی شروعات ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہوئی یعنی یہ کہ تیونس کا ایک تعلیم یافتہ مگر مفلس و خوددار نوجوان جو بے روزگاری اور بدعنوانی کی وبائے عام کی وجہ سے ملازمت نہیں حاصل کر سکا تھا، ایک سڑک پر ٹھیلہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک خاتون پولس افسر کے ہاتھوں ذلیل اور زدوکوب کیا گیا، اور اس غریب نے عاجز آ کر خودسوزی کر لی، بس پھر اچانک اس واقعہ کی خبر ملک بھر میں

(باقی صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص نظریہ
علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط وتعلق

[یہ وقیع مقالہ الفرقان: صفر ۱۳۶۰ھ (فروری ۱۹۴۱ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا، امید ہے کہ اہل علم بالخصوص فکر ولی اللہی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، اس کا بغور مطالعہ کریں گے —— مدیر]

حکمت کی تعریف:

جدید وقدیم فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ اور حکمت کی جو تعریفیں کی ہیں اُن کا خلاصہ اور نچوڑ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

''حکمت نام ہے قول وعمل میں درست کاری اور حق وراستی کی معرفت کا، پس اگر یہ معرفت اور درست کاری اشیاء کے پوشیدہ اثرات، اور اسباب ومسببات کے باہمی تعلق وارتباط سے آگاہ کرتی ہے تو اس کو حکمت علمیہ کہتے ہیں۔''

اس پوری حقیقت کو قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے: **وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا** ''جس شخص کو حکمت سے حصہ دیا گیا ہے بلاشبہ اس کو زبردست بھلائی دی گئی اور بہت بڑا کمال بخشا گیا۔

اور اگر مسطورہ بالا معرفت اور آگاہی رموز قدرت کے مطابق ہر شے کو اس کے مناسب جگہ دے تو اس کو حکمت عملی کہا جاتا ہے۔ [1]

حکمت کی عظمت:

حکمت اپنے اندر کیسے عظیم الشان کمالات رکھتی ہے اور حیاتِ انسانی کے ارتقا میں اس کا درجہ کس

[1] مدارج السالکین جلد ۲ ص ۴۴۲۔

قدر بلند اور پُرعظمت ہے؟ اس کا اندازہ جدید اور قدیم علمی کائنات کے اس ذخیرہ سے ہوسکتا ہے جو علمی نظریوں اور عملی سائنس کے ذریعہ ہماری مادی زندگی کی ترقی اور سربلندی کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا، اور دے رہا ہے۔ نیز ہماری روحانی نشوونما اور کمالات کے ارتقاء کا ضامن اور کفیل ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالقِ علوم نے اپنی ذات کے ساتھ اس کمال کو متصف ظاہر کیا ہے: ''اِنَّک انت العلیم الحکیم'' بلاشبہ تو ہی علم والا، حکمت والا ہے (یعنی سرچشمۂ علم وحکمت ہے) [1]

حکمت اور علم الاسرار:

یہی حکمت جب ''قوانین الٰہی'' (شریعت حقہ) کے رازہائے سربستہ اور حقائق ورموز سے آگاہی میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا نام ''علم الاسرار'' ہوجاتا ہے۔ اس وقت اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ دین ومذہب کے قوانین واصول کس طرح عقل وفطرت (نیچر) سے مطابقت رکھتے اور کس طرح کائنات کے انفرادی واجتماعی نظام کے لئے باعث فلاح وسعادت ہیں۔

دینی فلاسفر وحکماء:

اسلام میں سرتاجِ انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فلسفہ وحکمت کے اس خاص شعبہ ''علم الاسرار'' کا معلّم اول عمر بن الخطاب (فاروق اعظمؓ) کو اور معلم ثانی علی بن ابی طالب (حیدر کرارؓ) کو سمجھا جاتا ہے، عورتوں میں یہ سعادت سب سے پہلے ''عائشہ صدیقہ'' (رضی اللہ عنہا) کے حصہ میں آئی، اس کے بعد اسلامی گہوارہ میں بہت سی ماؤں نے ایسے بچوں کی پرورش کی جو غزالی، قشیری، رازی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور احمد سرہندی بن کر اس فلسفہ وحکمت کے ''امام'' کہلائے۔

حکیم الامۃ امام ولی اللہ دہلوی:

لیکن بارہویں صدی ہجری کے شروع میں یوپی کے غیر معروف قصبہ پھلت میں معلم اول حضرت عمر ابن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کی نسل سے ایک بچہ نے عالم وجود میں قدم رکھا، والدین کی جانب سے گرچہ اس کو احمد سے موسوم کیا گیا لیکن اپنے فطری کمالات اور ''علمِ اسرار وحکمت'' کی امامت کبریٰ نے اس آفتابِ حکمت کو دارالسلطنت دہلی میں ''ولی اللہ'' کے لقب سے مشہور کیا۔

---

[1] اخلاق جلالی ص ۲۶

یہ ایک حقیقت ہے کہ فیلسوفِ امت ولی اللہ دہلوی نے حکمت ربانی اور فلسفہ الٰہی کا جو ''اسلوب'' قائم کیا وہ اپنے تمام پیشتروں سے زیادہ ممتاز اور بہت زیادہ وقیع ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمام اسلامی اور غیر اسلامی حکماء وفلاسفر کے نظریہ اخلاق میں وہ حقیقت مفقود نظر آتی ہے جو اس حکیم وفیلسوف کے یہاں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔

حکیم الامت کا نظریۂ اخلاق:

شاہ ولی اللہ بہت سی پرعظمت کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف علوم وفنون کا نادر ذخیرہ ہیں مگر ان کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔ یہ کتاب علوم عقلیہ ونقلیہ کا بیش بہا گوہر اور انمول موتی ہے ''علم اسرار'' اور ''حکمت ربانی'' کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس میں وہ سب کچھ سپرد قلم کر دیا ہے جو انسانی سعادت کے انفرادی واجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی واخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ ''علم الاخلاق'' سے متعلق ہے جس میں اخلاق کے علمی نظریوں اور عملی درست کاریوں کو بہترین طرز نگارش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں جب آپ ''علم الاخلاق'' کے اُن مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں ''علم الاخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق'' پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماءِ اخلاق اور حکماء اور فلاسفر کو اس پر متفق پائیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں علم مابعد الطبیعۃ (میٹافزیکس) فلسفۂ طبیعی (فزیکس) علم الارتقاء (ایولیوشن) علم النفس (سائیکالوجی) علم المنطق (لاجک) جمالیات (ایستھٹک) فلسفۂ قانون (فلاسفی آف لاء) علم الاجتماع (سوشیالوجی) اور فلسفۂ تاریخ (فلاسفی آف ہسٹری) کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں کرتے کہ علمِ اخلاق کا کوئی تعلق اجتماعی علم المعیشت سے بھی ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس طرح کا ہے؟

ارسطو کی کتاب ''الاخلاق''، فلسفۂ اخلاق میں ابن مسکویہ کی کتاب ''السعادۃ'' اور ''تہذیب الاخلاق''، ماوردی کی ''ادب الدنیا والدین'' غزالی کی ''احیاء العلوم''، راغب کی ''الذریعۃ''، ابن قیم کی ''مدارج السالکین'' اور اسی قسم کی دوسری اخلاقی کتابوں میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ملتا، مشہور حکماء وفلاسفر اور علماءِ اخلاق کے تمام مباحثِ اخلاق کو غور وخوض سے مطالعہ کرنے کے باوجود اس سلسلہ میں ناکامی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ چنانچہ قدیم علماء وحکماء مثلاً ارسطو، افلاطون، سقراط، منکہ ہندی، رواقی، ابیقورئین، کندی، فارابی، ابی سینا، غزالی۔ ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، ابن ہیثم، ابن عربی، ابن مسکویہ، اور

اخوان الصفا کے بیان کردہ اخلاقی نظریے، جس طرح اس مسئلہ میں تہی دامن ہیں اسی طرح جدید علماءِ اخلاق مثلاً کاؤنٹ، اسپنسر، شوپنہار، دیکارٹ فرنساوی، بنتھم اور جون اسٹورٹ مل، سپنوزا، جرین، ہیگل کے حکمت فلسفہ کے تمام اخلاقی نظریے بھی اس سوال کے جواب میں واماندہ و بے چارہ نظر آتے ہیں۔

حالانکہ جرمن فلاسفر آگسٹ کمٹ اور کاؤنٹ اور انگریز فلاسفر ہربرٹ اسپنسر تو ان مشاہیر فلاسفروں میں سے ہیں جنھوں نے ''علم الاخلاق'' کے ساتھ ''علم الاجتماع'' اور ''علم الارتقاء'' کو منطبق کرنے کے لئے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پروازِ خیال اس رفعت و بلندی تک نہ پہنچ سکی جو ولی اللہ دہلوی کے حصہ میں آئی۔

متأخرین علماءِ اخلاق عارف رومانی، سعدی اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا مگر دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہے اور ہوتی رہی ہے یعنی ''اجتماعی اقتصادیات'' اس کا نشان یہاں بھی نہیں ملتا۔

غرض ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' وہ پہلی کتاب ہے جس نے ہم کو اس بیش قیمت علمی نظریہ سے روشناس کرایا کہ ''اجتماعی علم اخلاق کی فلاح وسعادت، اجتماعی معاشیات کے عادلانہ نظام پر موقوف ہے'' اور یہ کہ دنیا کی قوموں کا اجتماعی اخلاق اس وقت تک صحیح اور بہتر نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان کے درمیان ایک ایسا اجتماعی اقتصادی نظام قائم نہ ہوجائے جو افراط وتفریط سے پاک عادلانہ اصول رکھتا ہو۔

امام الحکمۃ ''ولی اللہ'' کے علاوہ تمام علماءِ اخلاق جدید ہوں کہ قدیم، یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو ''حسین'' بنانے کے لئے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے، اس لئے انھوں نے جدید علم الاخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ مگر ان تمام علماء سے جُدا ولی اللہ دہلوی نے دعویٰ کیا کہ ''اجتماعی اخلاق'' کا حسن اس وقت نہیں نکھر سکتا جب تک کہ اقوام کے جسم کو فاسد معاشی نظام کے جذام سے صحت نہ ہوجائے۔ اگر یہ ہوجائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسمِ اقوام میں دوڑنے لگے گا اور اس کے حسن وزیبائش کے لئے کسی خارجی پاوڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اجمال کی تفصیل:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء اخلاق کے نزدیک یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ علم الاخلاق کا علم الاجتماع کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اور وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے، لہٰذا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہوکر ہی زندہ رہ سکتا ہے، اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اس طرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اس سے بالکل قطع نظر کرلیں اس لئے کہ اس کے بغیر ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے اس کے اندر وہ کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل ومحاسنِ اخلاق میں مدد ملتی ہے یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟ ۱؎

''حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے، اور اس طرح وہ اپنے کنبے کا بھی عضو ہے، شہر وقریہ کا بھی، قوم کا بھی فرد ہے اور پھر تمام انسانی دنیا کا بھی'' ۲؎

ان حقائق کے پیش نظر انفرادی اخلاق کا تعلق اجتماعی اخلاق کے ساتھ ایک ناگزیر امر ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر بلاشبہ علم الاخلاق کا تعلق علم اجتماع کے ساتھ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے ۳؎۔ اور شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ ''مبحث ارتفاقات'' کے عنوان سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔'' ۴؎

پس ''اس مسلمہ عقیدہ'' نے ''انفرادی اخلاق'' کے مقابلہ میں ''اجتماعی اخلاق'' کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کردی اور یہ واضح کردیا کہ حیات انسانی میں اجتماعی اخلاق کی قیمت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی افادیت بہت زیادہ ہے۔

لیکن ''علماء اخلاق'' میں یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ ''اجتماعی اخلاق'' میں سے کس خلق کو شرف اور برتری حاصل ہے، کتب اخلاق میں اس بحث کو فضیلت کے باب میں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں سقراط، ارسطو، افلاطون، ابن مسکویہ اور دور حاضر کے علماء اخلاق کے مباحث کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے ان مباحث

۱؎ اخلاق وفلسفۂ اخلاق ص ۱۲۰۔ ۲؎ اخلاق وفلسفۂ اخلاق ص ۱۲۵۔ ۳؎ مختصر از اخلاق وفلسفہ ص ۲۴۵ تا ۲۴۷۔ ۴؎ حجۃ اللہ جلد ا ص ۳۸۔۳۹

کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''سقراط'' ہر شے کی صحیح معرفت کو سب سے بڑی فضیلت تسلیم کرتا ہے، ارسطو نظریہ ''اوساط'' کا قائل ہے یعنی یہ کہ ''ہر دو رذائل کے درمیان ایک فضیلت پوشیدہ ہے''۔

افلاطون کبھی اپنے استاذ سقراط کی تقلید کرتا نظر آتا ہے اور کبھی خواہشات نفس پر ضبط اور کنٹرول کو سب سے بڑی فضیلت شمار کرتا ہے۔

ابن مسکویہ ارسطو کی تائید میں مصروف ہے اور دور حاضر کے علماء فضائلِ اجتماعیہ کو بغیر کسی برتری اور فضیلت کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے نظر آتے ہیں، لیکن ولی اللہ دہلوی نے اصول اخلاق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ''اجتماعی اخلاق'' کے لئے صرف ایک ہی فضیلت کو اصل اور ''معیار'' قرار دیا ہے اور وہ ''عدل'' ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گفتار، اور شکل ولباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو ''ادب'' کہتے اور جب مالی حیثیت یعنی جمع وخرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (سول لبرٹی) کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہا جاتا ہے، اور اگر اس کو باہمی اخوت ومحبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی ''عدل'' کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے'' [1]

اجتماعی اخلاق میں عدل کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحب نے ظاہر فرمایا ہے ''علماء اخلاق'' کے لئے یہ ایک بہترین نظریہ ہے جو فضیلت سے متعلق، قدیم وجدید تمام مباحث کے اختلاف کے لئے یہ ایک ''محاکمہ'' اور فیصلہ کن مسئلہ کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے اجتماعی اخلاق میں ''عدل'' کی برتری کے ساتھ وہ تمام مشکلیں حل ہوجاتی ہیں جو فضیلت کی بحث میں علماء اخلاق کے سامنے رونما ہیں۔

عدل کا تعلق نظام انسانی سے:

فیلسوفِ امت ''شاہ ولی اللہ'' اجتماعی اخلاق میں ''عدل'' کو یہ حیثیت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا جواب خود انھوں نے ''عدل'' کی تعریف کرتے ہوئے دیا ہے ''حجۃ اللہ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۶۹

''عدالت ایک ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیر منزل، سیاست مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی معاملات کے لئے سہولت اور آسانی کے ساتھ ایک عادل اور پُراز خیر نظام قائم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس سے ایسے لطیف افکار کلیہ اور سیاسات عالیہ پھوٹ نکلتے ہیں جو اللہ تعالی اور اس کے عالم روحانیات کے نزدیک ٹھیک اور مناسب ہوں۔ ۱؎

اور فیوض الحرمین میں خلقِ حَسَن ''سمت صالح'' کی بحث میں فرماتے ہیں:

''اخلاق انسانی میں ایک خلق کا نام ہے ''سمتِ حسن'' (نیک سرشت) ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس ناطقہ ان اعمال واخلاق میں بیدار اور توجہ کامل حاصل کر لیتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان اور اس کے اور خدا کی تمام مخلوق کے درمیان وابستہ ہے اور ایسے ''نظام صالح'' کی جانب راہ پا جاتا ہے جو رضائے الٰہی کا منشاء ہے۔ سو جب اللہ تعالی اپنے بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو ان اعمال واخلاق کی سمجھ عنایت کرتا ہے، اور ''عادلانہ نظام'' کی جانب رہنمائی کرتا ہے''۔ ۲؎

معیشت کا نظام اور علم الاخلاق

اس طویل بحث کو اب اس طرح ترتیب دیجئے کہ ''انسان'' اگر اخلاق کریمانہ سے متصف نہیں ہے تو پھر وہ حیوانوں اور چوپایوں سے بھی بدتر ہے اور اس آیت کا مصداق ہے: ''لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿١٧٩﴾'' (الاعراف) اُن کے دل ہیں، پر سمجھتے نہیں، اُن کے آنکھیں ہیں، پر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی ہیں جو غفلت میں شرسار ہیں۔

اخلاق میں انفرادی اخلاق سے زیادہ اجتماعی اخلاق کا مرتبہ ہے، قرآن عزیز نے اگرچہ جُدا جُدا ہر قسم کے اخلاقی اصول بیان کئے ہیں لیکن جس آیت کو جامع اخلاق کہا گیا ہے اُس میں اُن ہی اخلاق کریمانہ کا ذکر ہے جو اجتماعی اخلاق کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''إن الله يأمر بالعدل

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۶۸۔۶۹۔ ۲؎ فیوض الحرمین ص ۸۷

والاحسان و ایتاء ذی القربی''۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک اور داد و دہش کا۔

پھر یہی آیت اس لئے بھی فیصلۂ ناطق ہے کہ اجتماعی اخلاق میں بھی ''عدل'' کا درجہ بلند و بالا ہے اس کہ ''عدل'' ہی سے احسان تک رسائی ہوتی ہے، اور عدل ہی ''ایتاء ذی القربیٰ'' کی توفیق بخشتا ہے، اس لئے آیت میں اُس کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔

پھر عدل ہی اس چیز کو منصۂ شہود پر لاتا ہے جو اجتماعی اخلاق بلکہ اجتماعی حیات کا مدار ہے یعنی ''نظام صالح'' بلاشبہ یہ ایک محور اور مرکز ہے اور تمام اجتماعی مسائل اسی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں، صرف اسی کے وجود سے اجتماعیات کا وجود ہے اور اسی کے فساد و فنا میں اجتماعیات کا فساد و فنا مضمر ہے۔

الحاصل ان ہر سہ درجات و منازل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عادل و صالح نظام کی صلاحیت اور اُس کا فساد کس شے کے ساتھ وابستہ ہے؟ یہ بظاہر ایک بہت معمولی سوال ہے لیکن اپنی حقیقت کے پیش نظر بہت اہم اور اجتماعی حیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہے۔

ارسطو کی کتاب ''الاخلاق'' اس کا جواب صرف یہ دیتی ہے کہ ''صالح نظام'' کا وجود ''حصول سعادت'' پر موقوف ہے جو اخلاقیات کے لئے ''مثلِ اعلیٰ'' ہے لیکن ''سعادت'' کس طرح ہم کو ایک مکمل اجتماعی صالح نظام تک پہنچاتی ہے، اس کا جواب ارسطو کے پاس نفی میں ہے، البتہ وہ ''علم الاخلاق'' سے الگ ہو کر اس کا جواب سیاسیات میں دینے کی سعی کرتا ہے اور اس طرح ''نظام اجتماعی'' کو اخلاق سے جدا کر دیتا ہے۔

سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی یہی حال نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کے متبعین مسلمان فلاسفروں اور حکماء کا حال ہے۔ ابن سینا، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، اس سلسلہ میں یہ سب اسی اسکول کو مانتے چلے آتے ہیں جس کی طرح یونانی فلاسفروں نے ڈالی تھی۔

امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عربی، اور رومی اگرچہ اخلاقیات میں ایک مستقل اسکول رکھتے اور ان کے لئے بہترین نوامیس قائم کرتے ہیں، تاہم اس سوال کے جواب میں ''عدل'' تک پہنچ کر وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور اُن کا فکر اس سے اوپر پرواز کرنے کو تیار نظر نہیں آتا۔

لیکن اس سوال کا جواب امام الحکمت ولی اللہ دہلوی کے پاس موجود ہے، اور بلاشبہ انھوں نے

''صالح عادل نظام'' کی صلاحیت کو جس اصل اور ناموس پر قائم کیا ہے وہ اُن ہی کا طغرائے امتیاز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انھوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے اُن پر غلبہ کرلیا تو اب اُن کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہوگئے اور اُن میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا، یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہوگئے جو بیجا عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیّا کرنے کے لئے عجیب وغریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے، اور قوم کے اکابر اس جدو جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہوسکتے، اور ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرسکتے ہیں، حتی کہ اُن کے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ اُن کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا اُن کے پاس عالیشان سربفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد وگرم حمّام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں، حشم وخدم اور حسین وجمیل باندیاں موجود ہوں، اور صبح وشام رقص وسرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام وسبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو، اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو، اور جس کا ذکر قصۂ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے ''معاشی نظام'' کا ''اصل الاصول'' بن گیا تھا۔ اور کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں یہ ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کرگیا تھا اور عوام وخواص سب میں ہی یہی جذبۂ فاسد پایا جاتا اور اُن کے ''معاشی نظام'' کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔

نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن وسکون مٹ گیا تھا، نا

امیدی کا ہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج وغم اورآلام ومصائب میں گھری نظرآتی تھی،اس لئے کہ ایسے مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اورآمدنی درکارتھی اوروہ ہرشخص کومہیّا نہ تھی،البتہ اس کے لئے بادشاہ ،نواب،امراء اورحکام نے معاشی دست بردشروع کردی،اوراس کاطریقہ یہ اختیارکیا کہ کاشتکاروں،تاجروں،پیشہ وروں اوراسی طرح دوسرے کارپردازوں پرطرح طرح کے ٹیکس عائدکرکے ان کی کمرتوڑ دی ،اورانکارکرنے پران کوسخت سے سخت سزائیں دیں،اورمجبورکرکے ان کوایسے گھوڑے اورگدھوں کی طرح بنادیاجوآب پاشی اورہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اور پھرکارکنوں اورمزدورپیشہ لوگوں کواس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات اورضروریات کے مطابق بھی کچھ پیداکرسکیں۔خلاصہ یہ کہ ظلم وبداخلاقی کی انتہاہوگئی تھی ۔اس پریشان حالی اوراورافلاس کانتیجہ یہ نکلاکہ ان کواپنی اخروی سعادت وفلاح اورخداسے رشتہ اور بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی ۔اوراس ’’فاسدمعاشی نظام‘‘ کاایک مکروہ پہلو یہ بھی تھاکہ جن صنعتوں پرنظام عالم کی بنیادقائم ہے وہ اکثریک قلم متروک ہوگئی اورامراءورؤساء کی مرضیات وخواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اورسب سے بہترحرفہ شمارہونے لگا۔

اورجمہورکی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کانمونہ بن گئی تھی اوران میں سے اکثرکاگذارابادشاہوں کےخزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوگیاتھا۔مثلاایک طبقہ جہادکئے بغیرباپ دادا کے نام پرمجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کررہاتھا،تو دوسرا مدبّرین مملکت کے نام سے پل رہاہے ۔کوئی بادشاہ اورامراء کی خوشامدمیں قصہ خوانی کرکےشاعری کےنام سے وثیقہ پارہاہےتوکوئی صوفی اورفقیربن کردعاگوئی کےزمرہ میں مالی استحصال کررہاہے۔

خلاصہ یہ کہ کسب معاش کےبہترین طریقوں کافقدان تھااورایک بڑی جماعت چاپلوسی ،مصاحبت، چرب زبانی اوردرباداری کےذریعہ معاش حاصل کرنے پرمجبورہوگئی تھی اور یہ ایک ایسافن بن گیاتھاجس نے ان کےافکارعالیہ اورذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹاکر

پست وارذل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دنائت وخسّت سے بھر گئے اور ان کی طبائع، اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاق کریمانہ کو گھُن لگ گیا، اور یہ سب اس ''فاسد معاشی نظام'' کی بدولت پیش آیا جو عجم وروم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالی کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلعہ قمع ہو جائے۔

اس نے ایک ''نبی امی'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا اور اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا وہ آیا اور اس نے روم وفارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم وروم کے رسم ورواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاڈالی۔

اس نظام میں فارس وروم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دست بُرد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر ودیباج کے نازک کپڑوں کا استعمال، اور تمام انسانی نفوس کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوشکوں اور رفیع الشان محلات وقصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش ونمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشا ومولد ہیں۔

بہر حال خدا تعالی نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک نہادی کا معیار اور ان پاک امور کے لئے میزان بنا دیا۔

اسی طرح شاہ صاحب ''ارتفاقات'' پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ واضح رہے کہ انبیاءؑ کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادت الٰہی سے متعلق ہے

مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی مین بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے، اسی لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے ''بُعِثتُ لاتمم مکارم الاخلاق''میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لئے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں ''رہبانیت'' کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط واجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت وثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح اُن کی معیشت ہو۔

پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں۔ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت وثروت ایک محبوب ومحمود شے ہے اس لئے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے ان کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو اس لئے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس سوئے تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت وثروت ایک بدترین چیز ہے جب کہ وہ باہمی مناقشات اور بغض وحسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت وثروت کے اطمینان قلب کو تعب اور حریصانہ کدوکاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہو اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دست بُرد کے لئے آمادہ کرتی ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت سے اور یاد الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔لہٰذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت وثروت ''نظام معیشت'' میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط وتفریط سے پاک ہو۔اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''اور یہ واضح رہے کہ اگر کسی شہر میں مثلاً دس ہزار انسان آباد ہوں تو سیاست مدن کے پیش

نظر از بس ضروری ہے کہ اُن کی صنعت وحرفت اور کسب وتجارت پر بحث کی جائے اور اُن کے معاشی مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔

سوا گر اہل بلدہ صرف شہری سیاست ہی کے دلدادہ ہیں اور اُن میں صنعت وحرفت کا تو شوق ہے مگر وہ زراعت اور مویشیوں کی نگہداشت اور ترقی کی جانب سے بالکل بے پرواہیں تو اُن کی دنیوی ترقی خسارہ میں ہے۔

اور اگر عیش پسندی میں غرق ہیں، نئی نئی قسم کی شرابوں کی ایجاد، اور بت گری کے ذریعہ عیاشی اور بت پرستی کی ترغیبات کے سامان مہیا کرتے ہیں اور مجسموں اور اسٹیچو بنا بنا کر بالواسطہ بت پرستی کے مشاغل کو قوت پہنچاتے ہیں تو یہ اُن کی دینی ہلاکت وتباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اس کے برعکس اگر اہل بلدہ صنعت وحرفت، تجارت، زراعت، شہری سیاست اور اسی قسم کے معاشی وسیاسی امور میں ایسے طریق کار پر گامزن ہیں جو ''حکمت'' کے اصول پر مبنی ہے اور مناسب پیشوں کی ترویج کا باعث ہے، نیز غیر مناسب اعمال اور شرعی واخلاقی نقطۂ نظر سے قبیح اور بدنتائج کا موجب نہیں ہے تو اہل بلدہ کی دنیوی زندگی بہت خوب اور صحیح ودرست ہے۔اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اگر کسی شہر یا ملک کے ذمہ دار اور سربرآوردہ ارکان معتدل معاشی نظام سے الگ ہوکر زیورات کی زیب وزینت ،لباس کی نزاکت ،عمارات کی بلندی ورفعت ،کھانے پینے کی اشیاء میں مفرطانہ تعیش ،اور عورتوں کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے خارجی زیبائش کی جانب راغب ہوجائیں اور ضروری حاجات اور مناسب ضروریات کی جگہ مصنوعی تعیش کو اختیار کرلیں جس طرح کہ آج کل عرب وعجم اس میں مبتلا نظر آتے ہیں تو پھر اکثر افرادِ ملک کا رجحان امور طبعیہ میں تصرف کے ذریعہ بناوٹی جگمگاہٹ پیدا کرنے کی جانب ہوجائے گا تا کہ وہ ملک کے سربرآوردہ افراد کی خواہشات کی تکمیل کرسکیں اور یہی معاشی زندگی کا مدار ہوجائے۔ چنانچہ ایک جماعت اگر کنیزوں کو (اور اس زمانے میں خود اپنی لڑکیوں کو) رقص وغیرہ کی تعلیم میں مشغول نظر آتی ہے تو ایک دوسری جماعت لباس میں قسم قسم کی نزاکتیں، نقش

ونگار، اور حیوانات واشجار کی تصاویر کی تزئین کرتی دیکھی جاتی ہے۔

اور ایک تیسری جماعت سونے چاندی اور جواہرات کے زیورات میں بے نظیر کاریگری اور طرح طرح کی اختراعات اور خارجی زیبائش کے غازوں اور قسم قسم کی صنعتوں میں منہمک رہتی ہے اور ایک چوتھی جماعت عمارتوں کی زیب وزینت، اُن کے مسرفانہ نقش ونگار، مینا کاری اور پچی کاری، رفیع الشان محلات وقصور کے نت نئے ڈزائنوں کی فکر میں مصروف پائی جاتی ہے۔

پس جب کسی ملک یا قوم کا ایک بہت بڑا گروہ اسی قسم کے مسرفانہ اور عیش پسندانہ صنعتوں میں منہمک ہوجاتا ہے تو پھر وہاں زراعت، تجارت، مفید صنعت وحرفت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور جب قوم کے سرمایہ دار اور ذمہ دار ارکان اپنی پونجی کو ان غیر ضروری اور فضول صنعتوں پر بے دریغ صرف کرنے لگتے اور اپنے رجحان طبع کو اس طرح ضائع کرکے داد تعیش دینے لگتے ہیں تو وہ اپنے ملکی اور شہری مصالح کو برباد کرتے اور صحیح نظام معاشی کو فاسد بناتے ہیں اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ضروری حرفے اور پیشے ہیں یعنی زراعت، تجارت اور شعبۂ صنعت وحرفت، اُن کے لئے ماحول تنگ ہوجاتا ہے اور ان کے لئے راہیں مسدود ہوجاتی ہیں، بلکہ ان پر محاصل اور ٹیکس کا اس قدر بار پڑتا ہے کہ کسی طرح وہ فروغ نہیں پاسکتیں۔ اور یہ مضرت آہستہ آہستہ ''خارش کی وبا کی طرح'' تمام افراد میں سرایت کرجاتی ہے اور معاشی نظام اور مدنی مصالح کو گھن لگ کر دنیوی زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور روحانی کمال اور اخروی زندگی پر اس قدر برا اور مہلک اثر پڑتا ہے کہ ناقابل بیان ہے۔

یہی مہلک جراثیم تھے جو عجم وعرب کے جسم تمدن ومعیشت میں پیدا ہوکر اس کی دنیوی اور اخروی صحت وفلاح کو برباد اور ان کی اخلاقی حیات کو تباہ کررہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ القاء کیا کہ وہ اس مہلک مرض کا علاج کریں اور عجم وعرب کو تباہی اور ہلاکت سے نجات دیں۔ اور علاج کے لئے طریقہ یہ اختیار کریں کہ مرض کی صرف اصلاح کافی نہ سمجھی جائے بلکہ اس فاسد مادہ کا ہی قلع قمع

کر دیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جو ان مہلک اثرات کا باعث ہے پس ذات قدسی صفات نے اسی مصلحت کے پیش نظر اس قسم کے تمام معاشی اور تمدنی نظام کو ممنوع قرار دے دیا جو اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب بنتے تھے۔ مثلاً رقص و سرود کی تعلیم، مردوں کے لئے حریر و دیباج اور اسی قسم کے ریشمی نازک لباس، سونے چاندی کی ایسی تجارت جو سود و ربا کا موجب بنتی ہو اور سود و قمار وغیرہ۔ ا؎

شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کی صداقت کے لئے پرانی تاریخوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں موجودہ یورپین حکمرانوں کی تاریخ ہی اس کے لئے زندہ شہادت ہے۔

کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے بعض یورپین اقوام اخلاقی مسائل میں بلند اخلاق اور مضبوط کیرکٹر کی حامل نظر آتی ہیں لیکن جب ان کی اجتماعی اخلاقی زندگی پر نظر ڈالئے تو غدر، فریب، بدعہدی، معاشی دست برد، استحصال بالجبر اور اسی قسم کی بداخلاقیوں کا سراسر مرقع نظر آتی ہیں، وہ معاہدات کرتی ہیں مگر بدعہدی کے لئے، مظالم توڑتی ہیں مگر آئین اور قانون کا نام دے کر، فریب کاریاں کرتی ہیں مگر تدبر اور سیاست کہہ کر اور معاشی دست برد روا رکھتی ہیں مگر تجارت اور تہذیب آموزی کا پردہ رکھ کر، حتی کہ انفرادی بداخلاقیوں میں سے بھی بدکاری، شراب خوری اور عیاشی ان کا مایۂ خمیر بن چکی ہے لیکن یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان کی معاشی نظام کی بنیادیں جمہور کی حاجتوں کے پورا کرنے کے اصول پر استوار نہیں کی گئیں بلکہ وہ سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہیں جس کو شاہ ولی اللہ کے نظریہ میں فاسد اور مذموم معاشی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس جس حکمراں قوم کا معاشی نظام رفاہیت کی افراط کا داعی اور معاشی دست برد کا حامل ہے اس قوم میں کبھی اجتماعی محاسن اخلاق پیدا نہیں ہو سکتے اور وہ قوم ہمیشہ اجتماعی بداخلاقیوں کا معدن ہوگی، کمزور اقوام کے لئے فتنہ بنے گی۔ اور تکبر، ظلم، حق تلفی، دوسروں کی تحقیر و تذلیل اور خودغرضی اور خوشامد پسندی جیسے مکروہ اخلاق اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں گے۔

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو قوم، غلامی یا دوسرے اسباب کی بدولت ایسے معاشی نظام سے دوچار ہو جو مفید اور عادلانہ رفاہیت سے خالی اور محروم ہے تو وہ دوسری قسم کی اجتماعی بداخلاقیوں کا گہوارہ بن جائے گی اور اس میں ذلت نفس، قنوطیت یعنی ناامیدی اور یاس، عجز، بزدلی افلاس اور گداگری جیسی

ا؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶

بداخلاقیاں نمودار ہوجائیں گی۔

پس شاہ صاحب کے زیر بحث نظریہ اخلاق کے پیش نظر اجتماعی اخلاق اور عادلانہ معاشی نظام میں ایسا تلازم ہے جو کسی طرح ایک دوسرے کو جدا ہونے نہیں دیتا۔ اور شاہ صاحب کی نظر میں اجتماعی اخلاق میں حسن وکمال جب ہی پیدا ہوسکتا ہے کہ حکومت کا معاشی نظام ایسے اعتدال پر ہو کہ جس میں نہ بیباکانہ عیش پسندی کا دخل ہو نہ افلاس اور فقر وفاقہ کا اور نہ وہ معاشی دست برد اور آئینی استحصال بالجبر پر قائم ہو اور نہ معیشت کے ترقی پذیر ذرائع سے خالی اور محروم ہو۔

حضرت شاہ صاحب فیوض الحرمین میں ایک مکاشفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں نے رؤیائے صادقہ میں دیکھا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نظام خیر کی تکمیل کے لئے اپنی منشاء ومراد کا آلۂ کار بنادیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمام مسلم ممالک پر کفار نے غلبہ کرکے ان کو تہہ وبالا کرڈالا ہے اور یہ دیکھ کر مجھ پر ایک غضب کی سی حالت طاری ہے اور میرے اردگرد رومی، فارسی، ازبک اور عرب وعجم کے مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہے کوئی گھوڑے پر سوار ہے تو کوئی اونٹ پر اور کوئی پاپیادہ اور وہ سب بھی میری طرح کفار کے اس غلبہ پر غضبناک نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفات کے میدان میں بقصد حج جمع ہیں آخر وہ میری جانب مخاطب ہوکر کہنے لگے:

''**ماذا حکم اللہ فی ھٰذہ الساعۃ** (اس حالت کے پہنچ جانے کے بعد اب خدا کا فیصلہ کیا ہے؟) میں نے جواب دیا: ''**فک کل نظام** (موجودہ تمام نظام ہائے عالم کو درہم برہم کردینا۔

امام الحکمت ولی اللہ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ چونکہ اب عالم میں اسلام کا وہ بنیادی نظام باقی نہیں رہا جس کا جزو اعظم ''صحیح معاشی نظام'' ہے اور جو جمہور کے امن واطمینان کا کفیل ہے تو اب تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے اور اس کے بعد ہی اس عادلانہ نظام کے قیام کی توقع کی جاسکتی ہے۔

امام ابویوسفؒ نے علم الاسرار کے معلم اول اور شاہ صاحب کے جدامجد حضرت عمر ابن الخطابؓ کا ایک مقولہ کتاب الخراج میں نقل کیا ہے، جو امام الحکمت کے نظریہ کی تائید کرتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک ذمی یہودی کو بھیک مانگتے دیکھ کر فرمایا: ''وہ حکمراں خدا کے سامنے سخت مؤاخذہ میں گرفتار ہوگا جس کی

قلمرو میں ایک بھکاری بھی مانگنے کے لئے مجبور ہو‘‘۔

الحاصل امام الحکمت شاہ ولی اللہ دہلوی وہ پہلا فلسفی اور علم الاخلاق کا پہلا حکیم ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ بیش بہا نظریہ پیش کیا کہ کسی قوم اکا جتماعی اخلاق تک پہنچنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے نظام حکومت میں ایسا ’’عادلانہ معاشی نظام‘‘ قائم نہ ہو جو افراط وتفریط سے الگ عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں فلاح وخیر اور امن وعافیت کا ضامن ہو۔اور بلاشبہ ’’ولی اللہی حکمت وفلسفہ‘‘ کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ اخلاقیات کو معاشیات کے ساتھ مربوط کرتی اور ان دونوں کے درمیان لازم وملزوم کا رشتہ ثابت کرتی ہے۔

☆☆☆

نگاہ اولیں کا بقیہ:

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں لاکھوں عوام سڑکوں پر آ گئے، اور تیونس کے اس صدر کو جو طویل عرصہ سے ملک پر حکومت کر رہا تھا اور سارے وسائل کا مالک بنا بیٹھا تھا اور جسے امریکہ، فرانس اور اسرائیل کی مکمل حمایت حاصل تھی، راتوں رات ملک سے فرار ہونا پڑا —— گویا ایک غریب ونادار نوجوان کا واقعہ اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہو گیا، —— کون سوچ سکتا تھا کہ ایک سڑک پر ایک غریب آدمی کے ساتھ پیش آنے والا ایک ایسا واقعہ، جس کی طرح کے بے شمار واقعات ہمارے ملکوں میں روزمرہ ہی پیش آتے رہتے ہیں، پورے عالم عربی میں اتنی زبردست عوامی لہر کا سبب بن جائے گا۔دراصل بات یہی ہے کہ اصل سبب ارادۂ الٰہی ہے۔اور وہ جب چاہے جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے، اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس کے ارادے کو کوئی بدل نہیں سکتا۔وہ رات سے دن اور مردہ سے زندہ کو نکالنے والا عظیم اور قادر مطلق رب ہے۔وحدہ لاشریک لہ،

اب ہم جیسے دور افتادہ لوگ-کم ازکم-اتنا تو کریں کہ عالم اسلام کے دکھ درد کو محسوس کریں، اور روزانہ اہتمام کے ساتھ نماز اور صدقہ وغیرہ کا اہتمام کر کے وہاں کے حالات کے لئے خوب دعائیں مانگیں۔

بارالٰہا! آپ کی مخلوق بہت پریشان ہے، آپ کے کروڑوں بندے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، زمین ظلم سے بھری جا رہی ہے، آپ کے کچھ بندے آپ ہی کی دی ہوئی ہمت کی بدولت قیام عدل کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اے الٰہ العالمین ان کی رہبری اور دست گیری فرما! اپنی نصرت شامل حال فرما! ان کوششوں کو صحیح رخ عطا فرما! اور ان کی نیتوں کو تمام ذاتی وگروہی اغراض سے پوری طرح محفوظ رکھتے ہوئے کامل درجے کا خلوص اور للّٰہیت انہیں نصیب فرما! اور ہمیں بھی حسّاس دِل، جفاکش بدن اور دوربین نظر عطا فرما!

حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم
ترتیب وپیشکش: محمد اختر معروفی

کیا ہم مرنے کے لئے تیار ہیں؟

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد
اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

{کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْن}

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون، وسلام علی المرسلین، والحمد للہ رب العٰلمین
اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰل سیدنا محمد و بارک وسلم
اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰل سیدنا محمد و بارک وسلم
اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰل سیدنا محمد و بارک وسلم

دنیا کی حقیقت

دنیا ایک گذرگاہ کے مانند ہے، انسان اس مسافر کی طرح ہے جو درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے آرام کرے پھر اپنے سفر پر روانہ ہوجائے۔ زندگی کی مثال ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کے مانند ہے، جس طرح ہوا میں رکھا ہوا چراغ ایک جھونکے سے بجھ جاتا ہے انسانی زندگی بھی ایک پل میں ختم ہوجاتی ہے

زندگی کیا ہے تھرکتا ہوا ننھا سا دیا ایک ہی جھونکا جسے آکے بجھا دیتا ہے
یا سر مدنہ غم کا تھرکتا ہوا آنسو پلک جھپکنا جسے مٹی میں ملا دیتا ہے

رونے والے کی پلکوں کے آنسو پلک جھپکتے ہی مٹی میں مل جاتے ہیں، ایسے ہی انسان کی زندگی کا معاملہ ہے۔ ہم اس دنیا میں رہنے کے لئے نہیں، واپس جانے کے لئے آئے ہیں، آنے کا مقصد ہی یہاں سے جانا ہے، آئے ہی اس لئے ہیں کہ ہم یہاں سے اچھے انداز سے جائیں، اس لئے اچھی زندگی کا معیار یہ نہیں کہ کون کتنا اچھا رہا، معیار یہ ہے کہ کون کتنی اچھی موت مرا، جس کو جتنی اچھی موت آگئی وہ اتنا خوش نصیب ہے، زندگی

میں تو خوشیاں اور غم سبھی کے لئے ہوتے ہیں۔

عقل مند کون؟

چند نوجوان صحابہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، پوچھا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! ''مَن اکیسُ الناس و أحزمُ الناس'' انسانوں میں سب سے زیادہ عقل منداور سمجھ دار کون ہے؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا: ''اکثرُھم ذکراً لِلموت'' وہ جوموت کو کثرت سے یادکرے ''وأکثرھم استعداداً لِلموت'' اور جوموت کی زیادہ تیاری میں لگا رہے ''أولٰئک الأکیاس'' یہ ہیں عقل مند لوگ ''ذھبوا بشرف الدنیاو کرامۃ الآخرۃ'' دنیا کی شرافت اور آخرت کی بزرگی وہ لے گئے، تو عقل مند وہ نہیں جو کاروبار بڑے کرلے، فیکٹریاں بہت لگالے، بزنس سجالے، نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ عقل مند وہ جو موت کو یاد رکھے اور موت کی تیاری میں لگا رہے یہ عقل مند ہے۔ آخرت میں اللہ تعالی جو نعمتیں دیں گے اس کے مقابلے میں دنیا کی نعمتیں تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتیں تو دنیا کے پیچھے لگ کر آخرت سے انسان غافل ہوجائے اس سے بڑا دھوکہ کوئی نہیں اور عجیب بات ہے کہ آج یہ دھوکہ لکھے پڑھے لوگوں کو لگا ہوا ہے، بات کرو تو جواب دیتے ہیں کہ کیا کریں ہمیں تو مرنے کی بھی فرصت نہیں، مقصدِ زندگی ذہنوں سے نکل گیا۔

کافرانہ و مؤمنانہ زندگی میں فرق

ایک چیز ذہن میں رکھیں کہ ایک ہے کافرانہ ترتیبِ زندگی، اور ایک ہے مؤمنانہ ترتیبِ زندگی، کافرانہ ترتیب یہ ہے کہ دنیا میں بہت مال ہو، دولت ہو، آرام ہو، آسائشیں ہوں، اچھا جیئو اور جینے دو، یہ ایک نقطۂ نظر ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اچھا مرو اور مرنے دو، جس کو بھی اچھی موت آگئی وہ خوش نصیب ہے کہ دنیا سے کامیاب ہو کے نکل گیا، کوئی کہتا ہے کہ آپ تو قید میں ہیں تو بہت اچھی طرح وہاں رہیں گے، آپ زیادہ لمبا رہیں، وہ کہے گا کہ دعا کرو میری جان جلدی چھوٹے، میرا گھر تو کوئی اور ہے۔ اسی طرح ہمارا گھر آخرت میں ہے، دنیا میں تو ہم قید خانے میں ہیں، ہاں جس نے موت کی تیاری کی اس کا مرنے کو دل چاہتا ہے، جس نے تیاری نہ کی اس کو مرنے سے ڈر لگتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک طوطا پنجرے میں ہو تو دو صورتیں ہیں، اس کے باہر کچھ طوطے اڑتے ہوئے آکے بیٹھ جائیں تو اندر والے طوطے کا دل چاہے گا کہ میں بھی باہر نکلتا، میں بھی اڑتا، میں بھی درختوں پر جاتا، وہ تڑپے گا کہ میں کیسے پنجرے سے نکلوں اور وہی طوطا اگر باہر دو بلیاں آجائیں تو وہ باہر نکلنے کے لئے نہیں تڑپے گا، اب وہ چھپ کے بیٹھ جائے گا اور کہے گا کہ

کوئی مجھے یہاں سے نہ نکالے۔ یہی مثال انسان کی ہے، جس نے آخرت کی تیاری کی ہوتی ہے وہ تڑپ رہا ہوتا ہے کہ میری کب موت آئے اور میں اپنے پروردگار کے پاس پہنچوں، اس لئے کہ اس کے لئے وہاں جنتیں ہوتی ہیں، اور جس نے گناہ کئے ہوتے ہیں اس کو تو اپنا انجام نظر آرہا ہوتا ہے، وہ تو موت کے تذکرے سے بھی ڈر رہا ہوتا ہے، کہتا ہے کہ آپ کو کوئی اور عنوان نہیں آتا؟ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر بندے کو جانا ہے، کسی نے کہا تھا: وہ مرتے مرتے بچا ہے، اس نے کہا: بچتے بچتے مرے گا، یہ نہ کہو کہ وہ مرتے مرتے بچا ہے، وہ بچتے بچتے مرے گا، آخر مرنا ہے، پوری دنیا میں آپ کو موت کا منکر کوئی نظر نہیں آسکتا، بڑے سے بڑا دہریہ ہوگا وہ بھی مانے گا کہ موت تو آنی ہے۔ تو اگر اس مسئلہ پہ سب متفق ہیں تو ایک سوال آج ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا ہے، کیا ہم موت کے لئے تیار ہیں؟ ہم اپنے دلوں سے پوچھیں، اگر اس کا جواب No ہے تو اس کا مطلب کہ ہم نے تیاری نہیں کی اور اگر Yes میں ہے تو اس کا مطلب کہ ہم نے اچھی زندگی گذاری ہے۔ کتنے کام ہم اپنے پیچھے پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں ان کے بارے میں بتانا سمجھانا کسی کے ذمہ لگانا پڑتا ہے، موت کا فرشتہ آکے کوئی وقت تھوڑی نہ دے گا وہ تو جہاں انسان ہوگا جس حال میں ہوگا بس اس کی روح نکال لے گا۔

خیر کے دروازے کو غنیمت سمجھنا چاہئے

چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی کتاب میں ایک حدیث مبارک نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے لئے خیر کا دروازہ کھول دے اس کو چاہئے کہ اس کو غنیمت سمجھے، وہ نہیں جانتا کہ یہ دروازہ کب بند کردیا جائے گا۔ مثال کے طور پر کسی کے والدین زندہ ہیں، وہ نہیں جانتا کہ یہ کب جدا ہوجائیں گے، کسی کے لئے اللہ نے صحت کا دروازہ کھولا ہوا ہے وہ نہیں جانتا کہ کب بیماریاں شروع ہوجائیں گی، کسی کے لئے رزق کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہ نہیں جانتا کہ کب تنگی کا دور شروع ہوجائے گا، کسی کے لئے اللہ نے سکون کا دروازہ کھولا ہوا ہے وہ نہیں جانتا کہ کب پریشانیوں کا دروازہ کھلے گا، اور ہم سب کے لئے اللہ نے زندگی کا دروازہ کھولا ہوا ہے ہم نہیں جانتے کہ کب یہ دروازہ بند کردیا جائے گا۔ تو جس کے لئے خیر کا دروازہ کھلا ہوا ہو وہ اس کو غنیمت سمجھے، اس کا فائدہ اٹھائے۔

موت کی تیاری کیسے کی جائے؟

''موت کی تیاری'' یہ الفاظ اکثر سنتے رہتے ہیں، موت کی تیاری ہے کیا؟ کوئی ورزش کرنا ہے؟

کوئی اکسر سائز کرنا ہے؟ نہیں، موت کی تیاری کا اصل معنی ہے کہ انسان جو گناہ کرتا ہے اس سے توبہ کرلے اور جو معاملات ہیں ان کو اپنی زندگی میں سمیٹ لے، لین دین کے جتنے مسئلے ہیں سب کو کلیر کرنا ہے، گناہوں کو چن چن کے چھوڑنا ہے، حتی کہ ایسا وقت آجائے کہ دل گواہی دے کہ میں اللہ کی نافرمانی جان بوجھ کے نہیں کرتا، جب انسان گناہوں سے توبہ کرلے، زندگی نیکی پر آجائے اور معاملات اور مالیات کے جتنے مسئلے ہیں ان کو سارٹ آؤٹ کرلے، جن کے جو حقوق ہیں ان کو ادا کردے یا بخشوالے، اب یہ بندہ اپنی موت کے لئے تیار ہے، اس کو کہیں گے کہ اس بندے نے اپنی موت کی تیاری کرلی۔

اور یہ ذہن میں رکھئے کہ جب آدمی مرتا ہے تو رونے والے مرنے والے کے لئے نہیں روتے، اپنے لئے روتے ہیں، ایک عابد کی موت آنے لگی، اس نے بیوی سے پوچھا کیوں رورہی ہو؟ اس نے کہا میرے خاوند مجھ سے جدا ہوجائیں گے، بیٹے سے پوچھا کیوں روتے ہو؟ کہا کہ میرے ابو چلے جائیں گے، ماں سے پوچھا اس نے کہا کہ میرا بچہ چلا جائے گا، اس نے کہا: تم سب اپنے لئے رورہے ہو، میرے لئے تو کوئی نہیں روتا، تو مرنے والے کے لئے کوئی نہیں روتا، سب اپنے لئے روتے ہیں۔

زندگی کا بہترین ساتھی

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی کے تین بھائی ہیں ایک بھائی کہتا ہے دیکھو میرا اور تیرا واسطہ زندگی تک ہے، تیری آنکھ بند ہوئی اور میں دوسرے کی گود میں پہنچا، دوسرا بھائی کہتا ہے نہیں نہیں، میں تمہارا زیادہ پکا بھائی ہوں، اگر تم فوت ہوگئے تو میں تمہیں نہلاؤں گا، کفناؤں گا، قبر میں دفن کرکے پھر واپس آؤں گا، آگے پھر آپ جانیں آپ کے اعمال جانیں، اور تیسرا بھائی کہتا ہے کہ میں بہت وفادار ہوں میرا تیرا ساتھ اس دنیا میں بھی ہے، قبر میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہوگا، جب تک تُو جنت میں داخل نہیں ہوتا میں تیرے ساتھ رہوں گا، نبی علیہ السلام نے فرمایا کون ہے اچھا بھائی؟ صحابہ نے کہا جو تیسرا ہے وہ سب سے اچھا بھائی ہے، جو کہتا ہے کہ آنکھ بند کرتے ہی میں دوسرے کے پاس چلا جاؤں گا وہ تمہارا مال ہے، مال تو اپنا نہیں رہتا، اب اس پر دوسروں کا اختیار ہوگا، اللہ جانے کیسے وہ تقسیم کرتے ہیں شرعی طور پہ کہ غیر شرعی طور پہ، کیسے ایک دوسرے سے جھگڑے کرتے ہیں، عام طور پہ تو دیکھا ہے کہ جس بندے نے وصیت نہ کی ہو تو پیچھے والوں کی زندگی جھگڑے میں گذرتی ہے، کچھ ظالم بن جاتے ہیں کچھ مظلوم ہوجاتے ہیں، اب پیسہ تو ان کے ہاتھ میں آیا اور ان کی ناانصافیوں کا گناہ اسی بندے کے سر پہ آیا کہ تم نے اپنے معاملے کو کلیر کیوں

نہیں کیا تھا، تو نے ان کو روڈ میپ دیا تھا تو نے ان کو ہدایت دی تھی کہ تیرے بعد ان کو کیا کرنا ہے، چونکہ تو نے مسئلے کو سارٹ آؤٹ نہیں کیا تھا، تم نے پرابلم کھڑی کی ہے، لہٰذا مزے وہ اڑائیں گے اور عذاب یہ بھگتے گا۔ تو یہ پہلا بھائی اس کا مال ہے، اور دوسرا بھائی اس کا حقیقی رشتہ دار بھائی ہے، انسان فوت ہوتا ہے تو وہ نہلا دیتا ہے، کفنا دیتا ہے اور آدمی کو قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیتا ہے اور دفن کرنے کے بعد پھر کہتا ہے کہ تجھے اللہ کے حوالے کیا، ارے اللہ کے بندے! جب اللہ کے حوالے ہونا ہی ہے تو جیتے جاگتے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کیوں نہیں کرتا، دو ہی طریقے ہیں، ایک یہ کہ جیتے جاگتے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے گا تو اللہ کے دوستوں میں شمار ہوگا، ورنہ سارے لوگ کندھوں پہ اٹھا کے لے جائیں گے اور اللہ کے حوالے کر کے آجائیں گے۔ ایک ہوتا ہے دوست کا آنا، ایک ہوتا ہے دشمن کا آنا، دنیا کی پولیس کو کسی بندے کو پکڑنا ہو تو بھیج کے ہتھکڑیاں لگاتی ہے، یہاں اللہ تعالیٰ رشتہ داروں کو پولیس بنا دیتے ہیں کہ اچھا یہ فوت ہو گیا، اس کو قبر میں ذرا جلدی پہنچاؤ، ہم اس کی گت بناتے ہیں، باپ بیٹے کا جنازہ اٹھاتا ہے، بیٹا باپ کا جنازہ اٹھاتا ہے، اپنے رشتہ دار، اپنے دوست، اپنے بھائی کا جنازہ اٹھاتا ہے، قبر میں دفن کر کے آجاتا ہے، انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے اس بندے کو کندھوں پہ گرفتار کر کے اللہ کے سامنے پیش کر دیا کہ اب آپ جانو آپ کا کام جانے، جن کی خاطر جھوٹ بولے، جن کی خاطر ملاوٹیں کیں، جن کی خاطر دھوکے دئے، جن کی خاطر دنیا کمائی، سب مٹی میں ڈال کے واپس آجاتے ہیں اور تیسرے دن کے بعد تو کوئی قسمت والا ہی یاد کرتا ہے ورنہ یاد بھی کوئی نہیں کرتا، ایک وقت آتا ہے کہ بندے کا نشان مٹ جاتا ہے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ میرے پردادا کا کیا نام تھا؟ تو مجھے یاد نہیں، زیادہ سے زیادہ والد کا اور دادا کا، بس اتنے ہی نام یاد ہوتے ہیں، اس کے اوپر کون تھا پتہ نہیں، ان کا تذکرہ مٹ گیا۔

پانچ نمازیں انسان کی زندگی کی مثال ہیں، صبح انسان کا بچپن، ظہر انسان کی جوانی، عصر انسان کا بڑھاپا، مغرب انسان کی موت کہ زندگی کا سورج غروب ہو جاتا ہے، اور عشاء کی نماز انسان کی زندگی کے تذکرے کا نام ونشان مٹ جانا ہے جیسے دن کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، عشاء کے وقت انسان کا دنیا سے نشان ہی اللہ مٹا دیتا ہے پھر دوسرا بھائی قبر میں پہنچا دیتا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب آدمی قبر میں لیٹتا ہے تو نماز اس کے دائیں طرف آجاتی ہے، روزہ اس کے بائیں طرف آجاتا ہے، قرآن مجید اس کے سر کی طرف آجاتا ہے، ذکر واذکار جو اس نے کئے

وہ پیر کی طرف آجاتے ہیں اور صبر ایک کونے میں اسٹینڈ بائی کھڑا رہتا ہے کہتا ہے کہ میں یہاں ہوں، کہیں سے بھی عذاب آیا تو اور کسی کو سپورٹ کی ضرورت ہوئی تو میں اس کو سپورٹ کروں گا تو ہمارے بھائی تو ہمارے اعمال ہوئے جو قبر میں ہمارے ساتھ گئے، لیکن ہم اعمال کمانے کے لئے تو اتنے فکر مند نہیں رہتے، یاد رکھیں! موت کی تیاری ایک بہت اہم عنوان ہے۔

زندگی میں موت کے پیغامات

داؤد علیہ السلام کے پاس ملک الموت آئے، فرمایا ملک الموت! تم نے کوئی قاصد کیوں نہیں بھیجا؟ انھوں نے کہا حضرت! کوئی سفید بال آپ کو اپنی داڑھی میں نظر آیا تھا؟ کہا ہاں، کہا وہ قاصد ہی تو تھا، پوچھا کوئی ہمسایہ فوت ہوا تھا؟ کہا ہاں، کوئی عزیز رشتہ دار فوت ہوا تھا جس کو آپ قبرستان لے گئے ہوں؟ کہا ہاں، ملک الموت نے کہا یہ سارے میسیج ہی تو ہوتے ہیں، مگر ہم ان کو اس طرح محسوس ہی نہیں کرتے کہ یہ ہمارے لئے میسیج ہیں، ہم تو سمجھتے ہیں کہ شاید ہماری زندگی میں ایک الارم بجے گا، اعلان ہوگا کہ اب فلاں بندے کی موت ہونے والی ہے، ہم وضو کریں گے، دو رکعت نفل پڑھیں گے، توبہ کریں گے اور پھر بڑی شان سے مرجائیں گے، ایسے تھوڑا ہی ہوتا ہے

دفعتاً سر پر جو آپہنچے اجل پھر کہاں تو اور کہاں دار العمل

پھر تو بندہ کھڑے پیر چلا جاتا ہے۔

موت کے وقت کے چند عبرتناک واقعات

پاکستان کے ایک ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر نور احمد نور، انھوں نے موت کے عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے تقریباً چالیس سال ایمرجنسی روم کے اندر ڈیوٹی کرتے ہوئے گذر گئے اور ہمیشہ میری کوشش ہوتی تھی کہ جو مریض آخری وقت پہ ہو میں اسے کلمہ کی تلقین کروں اور وہ کلمہ پڑھے، لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ سو میں سے پانچ بندے بھی اونچا کلمہ نہیں پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بندہ کو ہارٹ اٹیک ہوا، میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ کلمہ پڑھو، وہ کہتا ہے کہ ڈائجیسٹ ہے کوئی لے آ، ڈائجیسٹ ہے کوئی لے آ، تو میں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا یہ ڈائجیسٹ پڑھنے کا شوقین تھا یہ وہ مجھ سے مانگ رہا ہے، آخری وقت میں ڈائجیسٹ مانگ رہا ہے۔ ایک آدمی کے گردے خراب ہو گئے تھے، میں نے تلقین کیکہ کلمہ پڑھو، تو وہ کہتا ہے کہ مقدمے کا فیصلہ ہو گیا، مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا، میں نے تیماردار

سے پوچھا اس نے کہا یہ وکیل ہے اور کورٹ میں عدالتوں کے جو فیصلے ہوتے ہیں یہ اس کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ مقدمے کا فیصلہ ہوا یا نہیں ہوا۔

ایک زمین دار کی موت کا وقت آیا، میں کلمہ تلقین کر رہا ہوں اور وہ کہہ رہا ہے کہ بھینس کو چارہ ڈال دیا؟ بھینس کو چارہ ڈال دیا؟ جو انسان زندگی میں کرتا رہا ہوگا موت کے وقت خود بخود اس کی زبان سے نکلے گا، اگر ایک ایک دن میں ہزاروں دفعہ کلمہ پڑھا ہوگا تو بے اختیار کلمہ نکلے گا۔ اور اس نے لکھا کہ میں نے چند نوجوان ایسے بھی ڈیل کئے کہ موت کے وقت وہ ننگی گالیاں نکال رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ایک دیہاتی نوجوان آیا تھا اور اس کو بیماری ایسی تھی کہ وہ کہتا تھا کہ گلہ دب رہا ہے، گلہ دب رہا ہے، اور شور مچاتا تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا تھا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی اس سے ہمدردی ہوئی اور میں اس کی تیمارداری اور علاج معالجہ کرتا رہا، ایک دن اس کا والد آیا، وہ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا کہ اس کا اتنا زیادہ خیال نہ کریں، یہ اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے، میں نے پوچھا کیا کیا ہے؟ کہنے لگا: اس نے اپنی پسند کی شادی کر لی اور اس کی بیوی اس کو ماں کے خلاف بھڑکاتی تھی، اب بیوی کے بھڑکانے پر یہ ماں کو آ کے کہتا تھا خبردار! تو نے کوئی بات کی تو میں تیرا گلا دبا دوں گا، جو یہ ماں کو کہتا تھا اب موت کے وقت یہ خود اسی کو بھگت رہا ہے۔

موت کی تیاری کرنے والوں کے چند قابل رشک واقعات

تو موت کی تیاری ایک اہم کام ہے، جنھوں نے موت کی تیاری کی ہوتی ہے وہ موت کے فرشتے کو دیکھ کے خوش ہوجاتے ہیں کہ کتنا اچھا مہمان آیا، میں تو پچھلے ۱۸ سال سے تمہارا انتظار کر رہا تھا، سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے، ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ یہاں کوئی اچھی جگہ ہے کہ کوئی بندہ مر سکے؟ سوال دیکھیں کیسا ہے، تو وہ کہنے لگے کہ ہم بڑے حیران ہوئے، قریب میں کنواں تھا، ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی لوگ وہاں نماز بھی پڑھتے تھے، ہم نے کہا وہاں کنواں بھی ہے، مسجد بھی ہے، سایہ دار جگہ بھی ہے، وہ وہاں گیا اس نے جا کر وہاں وضو کیا، نماز پڑھی اور جیسے قیلولہ کے لئے کوئی لیٹتا ہے اس طرح لیٹ گیا، جب ظہر کا وقت ہوا تو ہم اٹھے کہ چلو نماز پڑھتے ہیں، ہم نے سوچا کہ اس کو جگا دیں، جب اس کو جگایا تو پتہ چلا کہ واقعی وہ فوت ہو چکا تھا تو جنھوں نے تیاری کی ہوتی ہے وہ یوں جاتے ہیں۔

حضرت فرید الدین عطارؒ اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ میری عطر کی دوکان تھی تو بہت چھوٹی چھوٹی ہزاروں

شیشیاں تھیں، ایک بڑے میاں داخل ہوئے اوران شیشیوں کو بڑی حیرانی سے دیکھنا شروع کر دیا، تو میں نے کہا بڑے میاں کیا دیکھ رہے ہو؟ تو انھوں نے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری جان اتنی شیشیوں میں اٹکی ہوئی ہے یہ کیسے نکلے گی؟ کہنے لگے کہ مجھے غصہ آیا، میں نے کہا کہ بوڑھے! جیسے تمہاری نکلے گی ویسے میری بھی نکلے گی، تو اس کے پاس ایک چادر تھی یہ بات سن کے وہیں میرے سامنے چادر پر لیٹ گیا اور کہتا ہے میری جان تو ایسے نکلے گی پھر کہا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، میں نے کہا: کیا ایکٹنگ کر رہے ہو؟ ہاتھ لگایا تو واقعی اس کی روح فوت ہو چکی تھی۔ تو جنھوں نے تیاری کی ہوتی ہے وہ یوں دنیا سے جاتے ہیں۔

ایک بزرگ تھے، ان کی بیٹی کا نام تھا حفصہ، تین سال کی چھوٹی سی بچی تھی، ان کے اوپر آخری وقت تھا، وہ بچی آئی اور وہ اپنے ابو کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہے، پہلے تو وہ اپنی بیٹی کو لیٹے ہوئے اپنے ساتھ لٹا لیتے تھے، سینے پہ لٹا لیتے تھے، بچی کھیلتی تھی، اس دن وہ بچی آئی، اس نے ابّو ابّو کہا، جب اس نے دیکھا کہ کوئی رسپونس نہیں تو وہ دوسرے کمرے میں جا کے رونے لگی، ماں نے پوچھا کیوں روتی ہو؟ اس نے کہا ابو مجھ سے بات نہیں کرتے، اب میں نے ابو سے کاٹ کر لی، مجھے ابو سے بات نہیں کرنی ہے، تو ماں نے تسلی دی، دلاسہ دلایا کہ آؤ میں تمہیں ابو کے پاس لے چلتی ہوں، وہ اس کو لے کے آئی اور پھر اپنے خاوند کو کہنے لگی کہ دیکھیں یہ بیٹی حفصہ آپ سے ناراض ہے تو حفصہ کو منالیں، تو ان بزرگ نے آنکھ کھولی اور کہنے لگے کہ کون سی حفصہ اور کیسی حفصہ، ہم نے اپنے یار کو منالیا اور لا الٰہ الا اللہ کہا اور فوت ہو گئے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اپنی موت کی تیاری اپنی جیتی جاگتی حالت میں کر لیں، مرنے کے بعد تیاری نہیں ہوگی۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ بہت کثیر البکاء تھے، بس ہر وقت آنسو ٹپکتے رہتے تھے، اللہ کے خوف سے روتے رہتے تھے، وفات ہوئی تو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حضرت کیا ہوا؟ کہنے لگے اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا: احمد علی! تو مجھ سے اتنا کیوں ڈر رہا تھا؟ کہتے ہیں چونکہ میں نے پڑھا تھا: ''مَن نُوقِش فِی الْحساب فقدعُذِّب'' تو جب پوچھا کہ تو کیوں ڈرتا تھا تو میں تو گھبرا گیا، جب میں گھبرا گیا تو اللہ تعالیٰ فرمانے لگے کہ آج بھی تو ڈر رہا ہے؟ آج تو تیری خوشی کا دن ہے، ہم نے تیری مغفرت کی اور جس قبرستان میں تمہیں دفن کیا اس قبرستان کے سب گنہگاروں کی مغفرت فرما دی۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جہاں دفن کیا گیا تو قبرستان کے سب گنہگاروں کی بخشش ہو جاتی ہے۔

موت کی تیاری کے چند اہم اعمال

اپنی غلطیوں پر معافی مانگنے میں دیر نہ کرنا

موت کی تیاری کہتے ہیں کہ انسان زندگی کے گناہوں کو چن چن کے ختم کرے، ڈھونڈ ڈھونڈ کے ختم کرے اور اپنے معاملات کو سارٹ آؤٹ کرے، اس میں دو تین نکتے ہیں وہ ذرا ذہن میں رکھیں، آج ان کو اکسپلین کر دینا اچھا ہے، پہلی بات تو یہ کہ ہمیں معافی مانگنے کی عادت نہیں اور یہ بہت بری عادت ہے، ہم زیادتی بھی کر لیتے ہیں معافی نہیں مانگتے، بہت ہی کوئی کوشش کرے گا تو سوری کہہ دے گا، سوری کوئی معافی تھوڑی نہ ہوئی، یہ تو طریقہ بھی کسی اور کا ہے، یہ الفاظ کہنے چاہئیں کہ پلیز مجھے معاف کر دیں، خاوند کے بیوی سے معافی مانگ لینے میں کوئی حرج نہیں، بیوی کے خاوند سے معافی مانگ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے حضرت مرشد عالمؒ کا واقعہ ہے کہ گھر میں وضو کر رہے تھے اور والدہ صاحبہ وضو کروا رہی تھیں، پانی ڈال رہی تھیں اب وہ پانی ڈالتے ہوئے ذرا دھیان کسی دوسری طرف چلا گیا، حضرت چاہتے تھے کہ پانی ڈالیں مگر دیر ہو گئی تو حضرت نے غصے میں ''ہوں'' کیا جیسے بندہ کسی کو متوجہ کرتا ہے، یعنی ڈانٹ دیا، والدہ صاحبہ خاموش رہیں، حضرت کہتے ہیں کہ وضو تو میں نے کر لیا، لیکن وضو کر کے جب میں مسجد کی طرف آنے لگا تو میرے دل میں خیال آیا کہ ابھی تو میں نے معمولی سی بات پہ بیوی کو ڈانٹا ہے اور ابھی رب کے سامنے جا کر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہوں گا تو میری نماز کہاں قبول ہوگی تو میں نے ایک بچے کو بھیجا کہ مسجد میں جا کر بتا دو کہ میں آ رہا ہوں میرا انتظار کریں —— ہمارے حضرت مرشد عالمؒ پوری زندگی جماعت کی امامت خود فرماتے تھے، الحمدللہ یہ عادت مبارکہ تھی —— حضرت فرماتے ہیں کہ میں واپس گھر آیا تو اہلیہ دیکھ کے حیران کہ مسجد نہیں گئے، میں نے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے جلد بازی میں آپ کو ڈانٹ دیا، آپ پلیز مجھے معاف کر دیں، تو وہ مسکرا پڑیں کہ نہیں کوئی ایسی بات نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہو، کہنے لگے کہ اس کے بعد میں مسجد میں آیا اور اب آ کر میں نے نماز کی امامت کروائی کہ اب میں نماز کی امامت کروانے کے قابل ہوں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ کی جب وفات ہوئی تو ان کی اہلیہ بتایا کرتی تھیں کہ جب سے شادی ہوئی حضرت نے پوری زندگی مجھ سے لہجہ بدل کے کبھی بات نہیں کی، ایسا ہوتا ہے کہ غصے میں لہجہ ذرا بدل جاتا ہے، لہجہ بدل کے بات ہی کبھی نہیں کی، ایک جیسے پیار سے پوری زندگی بات کی۔

حدیث پاک میں ہے کہ جو بندہ اپنے ماتحتوں کا حق ادا نہیں کرے گا، ذمی ہوں یا دوسرے ماتحت ہوں، ان پر زیادتی کرے گا اور قیامت کے دن وہ مظلوم آئیں گے تو ''أنا حجیجُهم یومَ القیمة'' میں قیامت کے دن ان ماتحتوں کا وکیل بنوں گا اور ان کو ان کا حق دلا کر رہوں گا، اگر قیامت کے دن اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیوی کے وکیل بن کر کھڑے ہو گئے کہ تو اسے کیوں ستاتا تھا، باہر عورتوں اور لڑکیوں میں ہر وقت پھنسا رہتا تھا اور گھر آنے کا وقت نہیں رہتا تھا اور آتا تھا تو بس اس کو ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتا رہتا تھا، رلاتا تھا، سکھ کا سانس نہیں لینے دیتا تھا تو اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیوں نہیں کرتا تھا اگر اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹارنی بن گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟ آج تو چلتا ہے کہ جس کے پاس مال ہے اس کا غصہ چلتا ہے، آج تو جس بیٹے کے پاس مال ہو وہ باپ کو ڈانٹے تو وہ بھی چپ ہو جاتا ہے اور جس کے پاس مال ہوتا ہے اس کا دماغ آسمان پہ پہنچا ہوا ہوتا ہے، یہی مال تو انسان کو قارون بناتا ہے، یہی تو انسان کو فرعون بناتا ہے، پھر بندہ کہتا ہے جو میں کہوں گا وہ ہوگا۔

ابھی اسی سفر میں جب یہاں آنا تھا تو راستہ میں ایک فیملی کا معاملہ تھا تو پتہ چلا کہ حافظ صاحب ہیں، تہجد پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، تکبیر اولیٰ قضا نہیں ہونے دیتے، خوب دین کا کام کرتے ہیں، لیکن پورے ۹ سال سے بیوی کو اپنے والدین سے نہیں ملنے جانے دیتے، کہتے ہیں کہ میرا حکم ہے تم نہیں جاسکتیں، بیوی حافظہ ہے، عالمہ ہے، روتی ہے کہ میں کیا کروں مجبور ہوں۔ اب بتائیں دین داروں کا یہ حال ہے، خود اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے سال میں تین دفعہ جاتے ہیں، کیا وجہ ہے کیوں نہیں جانے دیتے؟ کہتے ہیں کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہاں جائے، اس کا مطلب یہ کہ دوسرے کے احساسات کا کچھ لحاظ ہی نہیں، دنیا میں تو انسان یہ سب ناانصافیاں کر لیتا ہے، لیکن قیامت کا دن تو ہے ہی ''یوم التغابن'' امتحان کا اور فیصلہ کا دن، اے انسان! اس دن یا تو زندگی کی بازی جیت جائے گا یا زندگی کی بازی ہار جائے گا، وہ ہار جیت کا دن ہے۔ لہٰذا ہمیں دنیا میں اس دن کے لئے تیاری کرنی ہے۔ اسی لئے نبی علیہ السلام نے فرمایا: ''الکیّس مَن دان نفسَه و عمِل لما بعد الموت'' عقل مند وہ انسان ہے جو موت کی تیاری کرلے۔

ایک تو معافی مانگنے کی عادت ڈالیں، معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں، ہم نے دیکھا کہ جب جنازہ تیار ہوتا ہے تو ہمارے یہاں امام صاحب جنازہ پڑھانے سے پہلے کہتے ہیں کہ بھائیو! ورثاء کی طرف سے ایک اعلان: اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معاف کردیں، اب آپ بتائیں اس نے جس کی دل آزاری کی

ہوگی وہ جنازہ پڑھنے آئے ہوں گے؟ پھر اعلان کا کیا فائدہ؟ لطف اور مزہ تو جب تھا کہ یہ اپنی زندگی میں ان سے معافی مانگتے اور پھر اگر عورتوں کی دل آزاری کی تو عورتیں تو جنازہ میں ویسے بھی نہیں آتیں تو پھر اس اعلان کا کیا فائدہ ہوا؟ لہٰذا زندگی میں معافی مانگنے کی عادت بنالو۔

ہمارے ایک قریبی رشتہ دار بزرگ تھے، ان کی اتنی خوبصورت عادت تھی کہ جس کسی سے ملتے تھے، سلام دعا اور سلام دعا کے بعد ہٹتے ہوئے کہتے کہ آپ کے تو میرے اوپر بہت حقوق ہیں اور میں تو خیال نہیں کرسکا، آپ مجھے اللہ کے لئے معاف کردیں، بڑوں کو بھی یہی، ساتھ والوں کو بھی یہی، اپنے چھوٹوں کو بھی یہی کہتے تھے، ان کے عمل کو دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ واقعی بندے کو اس طرح ہر کسی سے معافی مانگنی چاہئے، چھوٹوں سے بھی مانگیں، بڑوں سے بھی مانگیں، اور پہلے ہی معافی مانگ لیں، ڈھیٹ بن کے اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرنا یہ شیطان کا شیوہ ہے، اپنی کوتاہی کو مان لینا یہ آدمؑ کی صفت ہے، یہ نبی کی صفت ہے، اس لئے ہمیں معافی مانگ لینی چاہئے، دوستوں سے معافی مانگنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اہل خانہ سے، چھوٹوں سے، بڑوں سے، کسی سے بھی معافی مانگنے میں کیا رکاوٹ ہے، تو پہلی بات یہ کہ عادت بنائیں کہ ہم دوسروں سے جیتے جاگتے معافی مانگیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے معافی مانگ لی تو دوسرا اگر مسکرا بھی پڑے گا تو معافی ہوجائے گی، اس لئے کہ مسکراہٹ دلیل ہے کہ اس بات سے وہ خوش ہوگیا ہے، اور زندگی میں معافی مانگنا بہت آسان ہے اور قیامت کے دن معافی مانگنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

اپنی زندگی میں وصیت نامہ تیار کرکے رکھنا

دوسری بات یہ کہ وصیت لکھنے والی جو سنت ہے اس پر عمل کریں، اس مجمع سے پوچھیں کہ کتنے بندوں نے وصیت لکھی ہے تو مشکل سے پانچ بندے نہیں کھڑے ہوں گے، اس کا مطلب ہے کہ موت کے لئے نہیں تیار ہیں، کہتے تو ہیں کہ موت کے لئے ہم تیار ہیں، لیکن کہاں تیار ہیں، ہم نے اپنے معاملات کو سمیٹا کہاں ہے، اس کے لئے علماء سے رجوع کریں اور ان کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھ کے مسئلے سمجھیں کہ میں اپنی زندگی میں کیا کیا کتنا دے سکتا ہوں، اور باقی کیسے شرعاً تقسیم ہوں گے، قرضہ دینا ہے تو بھی لکھیں، لینا ہے تو بھی لکھیں، جو بھی معاملہ ہے اور اپنے سب سے قریبی کو چاہے وہ بیوی ہو، چاہے وہ بھائی ہو، چاہے باپ ہو، چاہے بیٹا ہو، اس کو وصی بنائیں اور کہیں کہ دیکھو یہ میرے معاملات ہیں اور اس کو ایسے میرے بعد کرنا ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد بھائی تو بہنوں کو حصہ نہیں دیتے، الا ماشاء اللہ وہ تو بہت ہی متقی قسمت والے لوگ ہوتے

ہیں جو بہنوں کا حصہ نکالتے ہیں ورنہ تو عام دستور یہ ہے کہ جو حصہ ہوتا ہے وہ سب بھائیوں کے نام ہو جاتا ہے اور بعض جگہوں پہ بیوی کے ہاتھ میں آجاتا ہے، شریعت کتنی خوبصورت ہے کہ اس نے سب کے حصے نکال کے پہلے سے رکھ دئے کہ یہ حصے ہیں اس کے مطابق تقسیم کریں، اس مسئلہ کو اور اس چیپٹر کو علماء کے پاس بیٹھ کے سمجھیں، اور جیسے وہ سمجھائیں تو اپنے گھر والوں کو اس کے مطابق ہدایات کریں، لکھ کے رکھیں تاکہ آپ اپنی ڈیوٹی کو پورا کرسکیں، پھر وہ ذمّہ دار بنیں گے جنھوں نے اس پر عمل نہیں کیا ہوگا، آپ چھوٹ جائیں گے۔

حدیث مبارک سن لیجئے حضرت جابرؓ راوی ہیں ابن ماجہ کی روایت ہے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: ''ان رسول اللہ ﷺ قال'' کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''مَن مات علی وصیة'' جو بندہ اس حال میں مرا کہ اس نے اپنی وصیت کردی، جو بھی مالی معاملا تتھے اس نے اس کے بارے میں وصیت کردی، زبانی کی یا لکھ کر کی، ''مات علی سبیل'' اس کی سیدھے راستے پر موت آئی ''وسنة'' اور سنت پر موت آئی ''ومات علی تُقیً'' اور تقوے پر اس کی موت آئی ''وشهادة'' اور اس کو شہادت کی موت آئی۔ جو بندہ اپنی وصیت لکھ دیتا ہے یا وصیت کر کے جاتا ہے اللہ کے حبیب ﷺ فرماتے ہیں اللہ اس بندے کو شہادت کی موت عطا فرمائے گا، کتنا بڑا درجہ ہے یہ کہ شہادت کی موت اس پر ملتی ہے اور ہم نے اس کام کو نہ کیا تو اس کا مطلب ہے کہ تیاری نہیں کی، اس لئے وصیت کردینا اور اپنے معاملات کو بالکل صاف شفاف شیشہ بنا دینا چاہئے۔

موت کی بیماری والے سے جھوٹ بول کر موت سے بے فکر نہ کرنا

اور تیسری بات کہ آپ تیماردار ہیں اور کوئی دوسرا بندہ بیمار ہے تو خدا کے لئے بیمار بندے سے جھوٹ مت بولیں، یہ کتنی غلط بات ہے کہ اپنی ماں سے جھوٹ بولتے ہیں، اپنے باپ سے جھوٹ، اپنی بیوی سے جھوٹ، ہے وہ کینسر کا مریض، اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، بھائی! جھوٹ کیوں بول رہے ہو، ایک تو ہے یہ کبیرہ گناہ اور دوسرا یہ کہ اگر Chronic disease ہو اور اس کو موت آگئی تو اس کو غفلت میں مارنے کے ذمہ دار آپ بنیں گے، بچہ اگر بجلی کا ننگا تار ہاتھ میں لینا چاہے تو آپ انتظار کریں گے کہ جھٹکا لگنے دو پھر بتاؤں گا؟ نہیں! پہلے بتائیں گے، تو ادھر تو موت آنے والی ہے، ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ بچنے کی امید نہیں، اب نہ بتانا، کہتے ہیں کہ ابھی ہم نے ابّو کو بتایا نہیں ہے آپ بھی نہ بتائیں۔ مریض کو آپ

سے زیادہ اپنی بیماری کا اندازہ ہوجاتا ہے، یہ نہیں کہ پتہ نہیں ہوتا، ہاں کنفیوژ ہوجاتا ہے کہ میرا ذاتی احساس تو بتاتا ہے کہ میری بیماری خطرناک ہے اوراو پروالا کہہ رہا ہے کہ رپورٹیں اچھی ہیں، وہ بے چارہ کنفیوز ہوجاتا ہے اوراسی کنفیوژن میں موت آجاتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک تعلق والے تھے ہمیں ان کے وہاں جانے کا موقع ملا انہیں کینسر ہوگیا تھا، ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اتنا کینسر پھیل چکا ہے کہ آٹھ دس دن کے اندر ختم ہوجائے گا، اب اس کو لے کر گھر آگئے، جب میں عیادت کے لئے گیا تو ان کے بڑے بیٹے نے مجھے بلا کے کہا کہ حضرت! ہم نے والد صاحب کو کچھ نہیں بتایا ہوا ہے، آپ پلیز والد صاحب کو کچھ نہ بتانا، خیر ہم ان کے والد صاحب کے پاس گئے، بات چیت ہوئی، اب میں نے ان کو کہا کہ دیکھو زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، میں نہیں جانتا کہ میری موت پہلے آئے گی یا آپ کی موت پہلے آئے گی آنی تو ہے، لیکن یہ آپ کے سارے گھر والے آپ سے جھوٹ بول رہیں اور چونکہ آپ سمجھدار آدمی ہیں آپ میری بات کو سمجھیں گے، میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ڈاکٹروں نے ایک سے دو ہفتے کا وقت دیا ہے، میری بات کو سن کے ان کی آنکھ سے آنسو آئے اور کہنے لگے اللہ آپ کا بھلا کرے میں آپ کا احسان پوری زندگی نہیں اتار سکتا، میرا دل کہتا تھا کہ بیماری سنگین ہے لیکن سب کہتے تھے کہ آپ ٹھیک ہوجائیں گے اور میں کنفیوز تھا، میں اللہ سے معافی بھی نہیں مانگ پا رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے سب بچوں کو بلا لیا اور بلا کے کہا کہ دیکھو حضرت میرے محسن ہیں، انھوں نے مجھے وقت سے پہلے بتا دیا اور میں بالکل رنجیدہ نہیں کہ موت تو آنی ہے، اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں، ہاں کچھ مسئلے ہیں ان کو حل کرنے ہیں، اب اس نے لسٹیں بنوائیں، جائداد کیا ہے، پیسے کتنے ہیں، فلاں فلاں لوگ ہیں، ایک دن بیٹھ کر اس نے اپنی بیوی کے ساتھ تمام بچوں کے معاملات کو سارٹ آؤٹ کرلیا، جب سارٹ آؤٹ کرلیا تو اس کے بعد اس نے سارے رشتہ داروں کو بلوایا اور رشتہ داروں میں جتنی لڑائیاں جھگڑے تھے اس نے کہا کہ دیکھو بھائی! میں مہمان ہوں جا رہا ہوں اگر تم آپس میں صلح کروگے تو میرے دل کو خوشی ہوجائے گی، برسہابرس کے جھگڑوں کو حل کروادیا، جو رشتے بچوں کے آئندہ کرنے تھے ان کو بھی طے کروادیا، ایک ہفتے میں اس اللہ کے بندے نے اتنے کام سیدھے کردئے کہ جب اس کے جنازے پر میں گیا تو اس کی فیملی کا ہر بندہ کہہ رہا تھا کہ جو احسان آپ نے پوری فیملی پہ کیا یہ احسان کوئی نہیں کرسکتا اور پھر ایک ہفتہ اس نے نمازیں اور تلاوت اور تسبیح کی پابندی کی اور ماشاء اللہ خوب رجوع الی اللہ کے ساتھ وہ دنیا سے چلا گیا۔ موت

تو آنی تھی یہ تو شیطان کا ساتھ دینے والی بات ہے کہ بھائی اس کو خبر نہ ہونے دو، ہاں جب موت کا وقت آئے تو غفلت میں مرنے دو یہ کہاں کی عقل مندی ہوئی؟ کہتے ہیں کہ بتائیں گے تو ان کو دکھ ہوگا، بھائی! ان کو اس کا دکھ نہیں ہوگا کہ میں مرنے والا ہی ہوں، دکھ تو ہوگا جب غفلت کی موت مر کے چلا گیا تو وہ کہے گا یہ کیسے بدبخت میرے بچے تھے کہ جنھوں نے موت کے وقت بھی نہیں بتایا۔

شریعت کا حکم ہے کہ میت کو کلمہ کی تلقین کرو، تو کیا کلمہ کی تلقین یہی ہے کہ اس کو کہو کہ موت نہیں آرہی ہے، آپ اطمینان رکھو کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس کا مطلب کہ ہم جھوٹ بھی بول رہے ہیں اور حدیث کے خلاف بھی کر رہے ہیں۔ ذہن میں رکھیں کہ ہم مسلمان ہیں، کافر کی موت ایسی ہوتی ہے کہ بیوی تسلی دے رہی ہوتی ہے میں آپ کو پھولوں کا گلدستہ بھیجوں گی، وہ تو ہے ہی کافر اسی بات پہ وہ خوش ہوجائے گا، لیکن مسلمان تو مسلمان ہے، اس لئے کبھی بھی کسی بیمار بندے سے جھوٹ مت بولیں، آپ اس کے ساتھ اتنی زیادتی کریں گے کہ اس کا خمیازہ کبھی نہیں پورا کر سکتے سچ سچ بتادیں اس کو بتادیں وہ اللہ سے معافی مانگ لے گا، ایک بندے کو ایک ہفتہ مل جائے معافی مانگنے کا میں کہتا ہوں کہ وہ خوش نصیب انسان ہے کہ اس کو ایک ہفتہ مل گیا۔

موت کے وقت بے ہوشی کا ٹیکہ لگوانا ایک سنگین جرم

چوتھا نکتہ کہ اگر آپ تیماردار ہیں اور کوئی بندہ بیمار ہے، بیوی، بچے، ماں، باپ، کوئی بھی ہو تو ڈاکٹروں کو کہیں کہ وہ موت سے پہلے اس کو بیہوشی کا ٹیکہ نہ لگائیں، نوٹ کریں اس بات کو، ان ڈاکٹروں کو اللہ ہدایت دے، مسلمان ڈاکٹرں کو دیکھا کہ آخری وقت ہوتا ہے بیہوشی کا ٹیکہ لگا دیتے ہیں تاکہ کلمہ بھی نہ پڑھ سکیں، یہ موت کے وقت کی تکلیف کیا تکلیف ہے، اس تکلیف پر گناہ معاف ہو رہے ہیں، آپ اس تکلیف کو دیکھیں گے یا جہنم کی تکلیف کو دیکھیں گے، جب جانا ہی ٹھہرا اور مرنا ہی ہے اور وہ جان کنی کے عالم میں ہے تو آپ یٰسین پڑھیں، آپ اس کو کلمہ پڑھائیں، آپ اللہ سے دعائیں مانگیں، بیہوشی کا ٹیکہ لگا کر بغیر کلمہ کے اس کو نہ مرنے دیں، ورنہ آپ اس پر ظلم کریں گے، ہاسپیٹل میں لے جانا بھی پڑے تو پہلے بتادیں کہ ہم مسلمان ہیں دوائیاں دیں اگر دینا ہو، بیہوش نہ کریں۔

اس کو مختلف طریقے سے دیکھیں ہمارے نزدیک تو موت کا وقت بڑا اہم وقت ہوتا ہے، اس وقت دماغ حاضر ہونا چاہئے تاکہ وہ کلمہ پڑھ سکے، اللہ کو یاد کر سکے، اللہ سے معافی مانگ سکے، اب چار گھنٹے پانچ گھنٹے پہلے ہی ٹیکہ لگ گیا، اب کلمہ پڑھ کے گیا یا کلمہ پڑھے بغیر گیا کون جانے اس کے ساتھ کیا ہوا، اس لئے

ڈاکٹر حضرات کو آپ سختی سے منع کریں کہ ہم مسلمان ہیں ہمارا موت کے بارے میں نظریہ اور تصوّر وہ نہیں ہے جو عام بندے کا ہوتا ہے، عام دنیادار بندے تو یہی کہیں گے کہ بس اس کو لگا دو ٹیکہ کہ یہ خاموشی سے چلا جائے، ہم تو سکراتِ موت کی جو تکلیف ہے اس کو بھی بخشش کا ایک عمل سمجھتے ہیں، کتنے لوگ ہوتے ہیں کہ جن گناہوں کی انھوں نے معافی نہیں مانگی ہوتی ہے اللہ آخری وقت میں سکراتِ موت کی ان کو تکلیف دے کر اللہ ان کے گناہوں کو دھو کے بھیج دیتے ہیں۔ تو یہ تین چار باتیں ہیں جن کے بارے میں اکثر غلطی اور کوتاہی ہو جاتی ہے کیونکہ موت کے بارے میں ہمارا تصور ٹھیک نہیں ہے۔

اور اگر کوئی آدمی آخری لمحے میں ہے تو ایک غلطی لوگ یہ کرتے ہیں کہ پوچھتے ہیں ابّو آپ نے مجھے پہچانا، چھوٹے بچے کو آگے کر دیں گے کہ ابو یہ حفصہ آئی ہے اسے پہچانا؟ ارے بھائی! ساری زندگی تو اس نے آپ لوگوں کو پہچانا، اب تو کسی اور کو پہچاننے کا وقت ہے، مرنے والے کو تنگ کر دیتے ہیں، پریشان کر دیتے ہیں، اس کا دل چاہتا ہے کہ میں یکسوئی سے کلمہ پڑھوں، جو مر رہا ہوتا ہے اس کو کوئی پانی دے رہا ہے، کوئی کچھ کر رہا ہے، ابو کو مصروف رکھ رہے ہیں، ابو کو مصروف رکھنے کا یہ وقت نہیں ہے وہ تو توجہ الی اللہ کا وقت ہے، اس لئے شریعت نے کہا کہ آپ اگر پاس ہیں تو بس آپ اونچی آواز سے کلمہ پڑھیں تا کہ ان کو بھی سبق یاد آجائے اور آپ کو بھی یاد ہو جائے کہ ہم نے کلمہ پڑھ لیا ہے، اس وقت میں شیطان پورا زور لگا رہا ہوتا ہے۔ ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ موت کے وقت میں بندے کو ایمان سے ہٹانے کے لئے شیطان آخری کارڈ کھیلتا ہے، وہ بدبخت جو جیتے جاگتے ہمیں ورغلاتا ہے، جب موت کے وقت وہ آخری کارڈ بھی کھیلے گا تو پھر کیا بنے گا اور اس وقت میں ہم غافل ہوتے ہیں، وہ تو رجوع کا وقت ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہے، اس لئے جب بھی کوئی بیمار ہو تو اس کو یہ کہنا چاہئے کہ لاالٰہ الاانت سبحانك انی کنت من الظالمین چالیس مرتبہ پڑھے، اللہ بیمار بندے کے پیچھے سب گناہ کو معاف کر دیں اور دوسرا اس کو تلقین کرے، کہیں کہ امی! آپ کلمہ پڑھتی رہیں شفا ہو گئی تو سبحان اللہ! ذکر کا ثواب مل جائے گا اور اگر موت آنی ہے تو انشاء اللہ ذکر کے ساتھ دنیا سے جانا نصیب ہوگا، تو کلمہ جتنا پڑھا سکیں پڑھائیں، یہ اوپر والوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے، جو اوپر ہوتے ہیں ان کو ان باتوں کا خیال کرنا ہوتا ہے۔

اس لئے موت کی تیاری ہم بھی کر لیں جیتے جاگتے کر لیں، حتی کہ انسان کا ایسا معاملہ ہو کہ وہ بیٹھ کے سوچے کہ اگر اسی وقت موت آجائے تو مجھے کوئی مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں جانے کے لئے تیار ہوں، یہ ہیں عقل مند انسان جنھوں نے موت کی تیاری کر لی اور جو اپنے اللہ کے پاس جانے کے لئے تیار ہیں جنھوں نے محنت کی ہوتی ہے۔

سید العاشقین ابن فارضؒ کو موت کے وقت میں جنت کا منظر دکھایا گیا تو انھوں نے چہرہ ہٹالیا، چہرہ ہٹا کر یہ شعر کہا کہ

ان کان منزلتی فی الحب عندکم

اے اللہ اگر آپ کی محبت میں ساری زندگی کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے یہ باغ ملنا تھا

ماقدر أیتُہ قد ضیَّعتُ أیامی

میں نے تو پھر اپنی پوری زندگی ضائع ہی کر دی، مجھے باغ نہیں چاہئے مجھے باغ والا چاہئے، مجھے باغ کا پروردگار چاہئے۔ یہ ہوتے ہیں جنھوں نے اللہ سے محبت کی ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن جحشؓ ایک صحابی ہیں ان کے بیٹے کا نام تھا جابرؓ، والد شہید ہو گئے تو خواب میں انھوں نے اپنے والد کو دیکھا پوچھا ابا جان کیا ہوا؟ کہنے لگے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی اور اللہ تعالیٰ بہت خوش تھے کہ عبداللہ تو نے میرے نام پہ اپنی جان دے دی، مانگ مجھ سے کیا مانگتا ہے، پوچھا ابا جان! آپ نے کیا مانگا؟ کہا بیٹے! میں نے یہ کہا کہ اللہ! میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے پھر زندہ کر دے پھر شہید کیا جائے پھر زندہ کیا جائے پھر شہید کیا جائے، ایسی بھی خوش نصیب موت ہوتی ہے، اس لئے بھائی توبہ کا دروازہ ہم سب کے لئے کھلا ہے، نیکوں کے لئے بھی کھلا ہے، بروں کے لئے بھی کھلا ہے، ہم اپنے گناہوں سے توبہ کر کے جو موت سے متعلقہ ذمہ داری ہے اسے پورا کرلیں تاکہ موت کی تیاری کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہو جائیں، انسان کی موت کا غرغرہ جب شروع ہوتا ہے اس سے پہلے پہلے جب بھی توبہ کر لے اللہ کے یہاں توبہ قبول ہوتی ہے، وہ بڑے کریم ہیں بڑے رحیم ہیں، چنانچہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے کہ قارون نے حضرت موسیٰؑ پر ایک عورت کے ذریعہ سے بہتان لگوایا تھا تو حضرت موسیٰؑ کو بہت دکھ ہوا تو اللہ تعالی نے زمین کو تھوڑی دیر کے لئے موسیٰؑ کے کنٹرول میں دے دیا کہ اے میرے پیارے موسیٰؑ آپ زمین کو جو حکم دیں گے وہ مانے گی، تو موسیٰؑ نے کہا اے زمین! قارون کو نگل جا، تو ایک تہائی وہ زمین کے اندر چلا گیا، تو معافی مانگنے لگا، رو رہا تھا کہ غلطی ہو گئی، موسیٰؑ جلال میں تھے، پھر حکم دیا وہ دو تہائی زمین میں چلا گیا، پھر معافی مانگ رہا تھا مگر موسیٰؑ بہت جلال میں تھے، پھر تیسری مرتبہ کہا تو وہ پورا اندر چلا گیا، جب وہ زمین میں دھنس گیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی اے میرے پیارے موسیٰ! وہ روتا رہا آپ سے معافیاں مانگتا رہا، آپ غصے میں تھے، زمین کو حکم دیتے رہے کہ اسے نگل جا، اگر وہ مجھ پروردگار سے معافی مانگتا میں اس بندے کے گناہ کو معاف کر دیتا، وہ تو اتنے کریم پروردگار رہیں۔

ہم حیران ہوتے ہیں کہ جبرئیلؑ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آ کر یہ بتایا کہ اے

اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو دریا میں غرق کیا میں اس وقت وہیں تھا اور میں کیچڑ فرعون کے منہ میں دے رہا تھا کہ کہیں معافی نہ مانگے اور اس کی معافی قبول نہ ہوجائے، یہ تفسیر میں لکھا ہوا ہے، جبرئیلؑ نے کہا کہ وہ آپ کا دشمن تھا اور دہریہ تھا جب اس کی موت کا وقت تھا اور وہ کیفیت بنی تو میں اس کے منہ میں مٹی دے رہا تھا کہ کہیں اس وقت توبہ کے کلمات نہ نکل جائیں، جب وہ پروردگار معافی دینے کے لئے تیار ہے ہم معافی مانگنے میں کیوں کوتاہی کرتے ہیں؟ رب کریم ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں اپنی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ کاروباروں کو اور بڑھائے مگر ان کو سمیٹنا بھی ہمارا ہی کام ہے، صرف بڑھانا ہی ہمارا کام نہیں ہے، نہ سمیٹ کے گئے تو جتنی بے اعتدالیاں ہوں گی بوجھ ہمارے سر پر آئے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں موت کا صحیح تصور اور اس کی تیاری کی فکر کو اپنے دل میں بیٹھانے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

جناب قطب الدین ملا صاحب

ذبحِ عظیم

اسلام کی دو اہم عیدوں میں سے ایک ''عید قرباں'' ہے جو ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو سارے عالم میں منائی جاتی ہے، جو عربی ترکیب پر ''عید الاضحیٰ''، فارسی ترکیب پر ''عید اضحیٰ'' اور اردو میں بقرعید یا عید قرباں کے نام سے موسوم ہے۔ اس تقریب پر جانوروں کی قربانی دے کر ''سنتِ ابراہیمی'' کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے، جو کہ قربانی کی تاریخ میں ایک مثالی اور ممتاز واقعہ ہے۔ اس قربانی کا مقصد صرف جانوروں کو ذبح کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ بندگان خدا میں جذبۂ قربانی کو ابھارنا مقصود ہوتا ہے۔

قربانی کیا ہے؟ اپنی محبوب چیزوں کو خدا کی خوشنودی کے لئے خدا کی راہ میں نچھاور کر دینا۔ کبھی یہ امر متقاضی ہوتا ہے کہ اس کی راہ میں مال کی قربانی پیش کر دی جائے، کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ اپنی ہر شے کو اللہ کی راہ میں لگا دیا جائے اور کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آتی ہے کہ اپنی محبوب ترین متاع ''جانِ عزیز'' خدا کی راہ میں قربان کر دی جائے۔ امتثال امرِ الٰہی میں مزاحم ہونے والی طاغوتی قوتوں اور باطل طاقتوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جانا، اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں اور توانائیوں کو لگانا اور اس راستے کے مصائب و ابتلاء کو برداشت کرتے ہوئے امتحانِ دار و رسن سے گذر جانا، یہ سب کچھ قربانی کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔ ایسے موقعوں پر حقِ قربانی ادا کرنے کو کسی اور پر یا خود اپنے اوپر ایک جور و ظلم سے تعبیر کرنا، بذات خود ایک ظلم و جہالت ہے۔ انسان کے لئے انتہائی سعادت کی بات تو یہی ہے کہ وہ راضی برضا رہ کر اور سرشارِ وفا ہو کر امتثالِ امرِ الٰہی میں کوشاں رہے ؎

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

یہ ایثار و قربانیاں مقاصد کے حصول کے لئے از بس ضروری ہیں۔ حیاتِ بے کیف کو یہ ایثار و قربانی

ہی سرور وحلاوت اور سوز وگداز پیدا کر کے پُر کیف اور پُر بہار بنا دیتی ہے جو ہزاروں کو سرشار ووارفتہ بنا دینے کی موجب ہوتی ہیں۔اسی لئے ایثار وقربانی کا باب تاریخِ مذاہب کا ایک روشن ودرخشندہ باب ہے۔اسلامی تاریخ،ایثار وقربانیوں کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔سنت ابراہیمی کی اصل بنیاد ''قربانی'' ہے ،اسی لئے اگر اس کو ایثار وقربانی کا مذہب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

ویسے تو ماہ محرم میں اصل یاد تو اسلامی تاریخ کی عظیم ترین قربانی ہجرت نبوی کی ہونی چاہئے کیونکہ ہجرت سے اسلامی جنتری کی ابتداء کا فیصلہ کر کے سیدنا عمر فاروق ؓ کی قیادت میں صحابۂ کرام نے اس کا اعلان کر دیا تھا کہ حق، ملک ومال اور اسباب وسائل سے نہیں پھیلتا، بلکہ اللہ کے لئے سب کچھ قربان کر دینے،سب کچھ چھوڑ دینے سے پھیلتا ہے۔

اسلام کی تاریخ دراصل قربانیوں ہی کی تاریخ ہے۔حضرت حمزہؓ نے اپنی جان کی قربانی کچھ اس طرح پیش کی کہ ''سید الشہداء'' کہلائے۔حضرت عثمانؓ کی شہادت ایک عظیم شہادت ہے۔پھر ہزاروں مہاجرین اور انصار کی قربانیاں ہیں۔بعد کے دور میں ائمۂ اربعہ، بالخصوص امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا مثالی کردار ہے، یہ سلسلہ کسی مقام پر ختم ہونے نہیں پاتا ہے ؎

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

وہ کون ہے جو حق کی حمایت کے لئے کھڑا ہوا ہو اور اس کی راہ میں طاغوتی قوتوں نے رخنہ اندازی نہ کی ہو اور حامئ حق کو عظیم قربانیاں نہ دینی پڑی ہوں، یہاں تک کہ اپنی جانوں کی بازی لگا کر حق ادا کیا اور یوں سمجھا ؎

جان دی ،دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس معرکۂ حق وباطل میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چند بے وقعت سنگریزوں نے ایک عظیم الشان چٹان پر بظاہر غلبہ حاصل کر لیا لیکن بعد میں چل کر اسی ٹوٹی ہوئی چٹان سے ایک شیریں اور زمزمہ سنج چشمہ ابل پڑا جس نے ساری فضا کو مترنم بنا دیا، اور یہ امر ہر ایک کی روح میں شیرینی گھول دیتا ہے۔

جہاں پر اس عظیم قربانیوں کے دوررس اثرات مرتب ہوئے ،وہیں خود ان قربانی دینے والوں کی

شانِ جلالت ارفع واعلی ہوگئی۔ پھر یہ زندگیاں ایسی نہیں تھیں کہ ان کے نقوش کومٹا دیا جاتا یا بھلا دیا جاتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا احترام، ان کی عقیدت اوران کی محبت کروڑوں انسانوں کے دلوں میں بطورامانت اور ایک متاعِ بے بہا کی حیثیت سے آج بھی موجود ہے۔

ان قربانیوں کے پیچھے جوجذبۂ خلوص وللّٰہیت کام کررہا تھاوہ خدا کے نزدیک ایسا مقبول اور اتنا پسندیدہ ہوا کہ اس نے ان آزمائشوں سے استقامت وثبات قدمی کے ساتھ گذرنے والوں کے اسوۂ حمیدہ کو لوگوں کے لئے نمونۂ عمل بنادیا۔ انہیں خاصانِ خدامیں ایک حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ ان کی اس طرح کی عظیم قربانیوں کے واقعات ہرسہ کتب سماوی توریت انجیل اورقرآن مجید میں مذکورہیں۔ قرآن مجید کی ۲۵ سورتوں کی ۶۳ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ موجود ہے، یہی وہ مجددِ انبیاء ورسل ہیں جو بنی اسرائیل اورمسلمان سبھی کے یہاں قابل صداحترام ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پہلی ہستی ہیں جنھیں راہ عزیمت میں بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، اوران میں کامران وکامیاب ہوکر مرتبۂ خلیل سے مشرف ہوئے۔

پہلی آزمائش تو یہ تھی کہ نمرود نے ''ابلاغِ حق'' کے جرم میں انھیں دہکتی آگ میں جھونک دیا۔ صد آفریں جنونِ عشق کہ ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں ہو پائی اوروہ عشق خداوندی میں اپنے آپ کونذرِ آتش کردیتے ہیں۔ ؎

بے خطرکود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوتماشائے لب بام ابھی

پھر دنیانے ایک عجیب منظر دیکھا کہ جلاکرخاکستر کردینے والی آگ کے شعلے حضرت ابراہیم کے حق میں بردوسلام بن جاتے ہیں، اورآگ باندازگلستاں ہوجاتی ہے۔

دوسری آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب کہ امتثال امرالٰہی میں حضرت ابراہیمؑ کواپنے کمسن اوراکلوتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ اوران کی والدہ حضرت ہاجرہ کوایک لق ودق اوربے آب وگیاہ میدان میں چھوڑنا پڑا تھا۔ ۸۶۔۸۷ سال کی عمرتک حضرت ابراہیمؑ کی کوئی اولادنہیں تھی۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ خداوندی میں نیک وصالح فرزند کے لئے دعا کی تھی جوقبول ہوئی، اسی لئے بچے کا نام اسماعیل رکھا۔ عبرانی میں اس کا تلفظ ''شماع ایل'' ہوتا ہے، عبرانی کے ''شماع'' اورعربی کے ''سمع'' کے معنی ہیں ''سُن''، اور ''ایل''

کے معنی اللہ۔ چونکہ حضرت اسماعیلؑ کی ولادت کے بارے میں اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی تھی اس لئے یہ نام رکھا گیا تھا۔ خیر! ان دعاؤں اور تمناؤں کے ثمر، گھر کے چشم و چراغ اور اکلوتے شیر خوار بچے کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آتے ہیں اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے کہ کہیں شفقت پدری جوش میں نہ آجائے اور امتثالِ امر الٰہی میں لغزش نہ ہوجائے۔ یہ کس کی جرأت و ہمت کا کام تھا؟ بلاشبہ یہ حضرت ابراہیم کی شانِ جلالت اور علو مرتبت ہی کا حصہ تھا۔

بخاری کی حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو خانۂ کعبہ کے پاس زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر چھوڑا گیا تھا، اور ان کے پاس حضرت ابراہیمؑ نے صرف پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجوروں کی ایک تھیلی چھوڑی تھی۔ جب یہ پانی اور کھجوریں ختم ہوگئیں تو دونوں کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ بچے کی بے تابی ماں سے دیکھی نہ جاتی تھی، وہ حضرت اسماعیل کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں کہ اس حالت زار میں ان کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ پھر پانی کی تلاش میں کوہ صفا پر چڑھ گئیں، کہیں کچھ نظر نہ آیا تو دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، بیچ کے میدان میں ایک گڑھا سا تھا وہاں پہنچتیں تو بچہ نظر نہ آتا تھا، اِس لئے اتنا حصہ دوڑ کر طے کرتی تھیں۔ اس طرح صفا و مروہ کے درمیان ہاجرہ نے سات چکر لگائے۔ اللہ کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ بطور یادگار اس کو باقی رکھنے کا انتظام کیا۔ یہی وہ سعی بین الصفا والمروہ ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی، یہ آواز دینے والے خدا کے فرشتے حضرت جبرئیل تھے، انھوں نے اس جگہ اپنا بازو مارا جہاں آج زمزم ہے، اسی وقت وہاں سے پانی ابلنے لگا۔ یہی وہ پانی ہے جو بہت مبارک اور متبرک ہے اور جسے حجاج کرام سوغاتِ حجاز کے طور پر اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے چھوڑ جاتے وقت حضرت ہاجرہ نے پورے ایمان و توکل کے ساتھ کہا تھا کہ اگر اللہ کے حکم سے ہمیں اس جگہ چھوڑا گیا ہے تو ہمیں کسی بات کا غم نہیں، بلاشبہ وہ ہم کو ضائع و برباد نہیں کرے گا۔ اللہ اللہ! ہاجرہ کا وہ یقین اور حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا اور ان کا ایثار رنگ لاتا ہے کہ خدا انھیں ضائع کرتا ہے نہ برباد۔ بلکہ ان کی ایک ایک ادا کو زندہ و تابندہ رکھنے کا انتظام ہوتا ہے، چاہِ زمزم جب تک باقی رہے گا اور سعی بین الصفا والمروہ کا عمل جب تک جاری رہے گا اس عظیم واقعہ کی یاد دلاتا رہے گا۔

ان دونوں کٹھن منزلوں سے گذرنے کے بعد اب تیسرا امتحان ہے جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ

سخت، زہرہ گداز اور جاں گسل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ انبیاءؑ کا خواب رؤیاء صادقہ اور وحیٔ الٰہی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ پیکر رضا و تسلیم بن کر تیار ہو جاتے ہیں اور اپنے بیٹے سے اپنا خواب اور خدا کا حکم سناتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ جن کے لئے ذبیح اللہ کا عظیم الشان شرف مقسوم ہو چکا تھا فرماتے ہیں: اے میرے باپ! اگر خدا کا یہی حکم ہے تو اس کو پورا کر دیجئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے۔ تقریباً سو سال کا بوڑھا باپ ۱۳۔ ۱۴ سال کے سعادت مند بیٹے کو جنگل کی طرف لے جاتا ہے کہ اس کی حلق پر چھری پھیر کر اللہ کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ کہتے ہیں ان موقعوں پر شیطان رجیم نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، انھوں نے لعنت کے اظہار کے طور پر اس کو ''رجم'' کیا، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں، اسی لئے شیطان کو ''رجیم'' (یعنی کنکریاں مارا گیا) کہتے ہیں۔ آج بھی حج کے موقع پر یہ عمل اسی انداز میں ادا ہوتا ہے۔ الغرض مروہ پہاڑی پر پہنچ کر حضرت خلیلؑ، حضرت ذبیح اللہ کے ہاتھ پیر ایک مذبوح جانور کی طرح باندھتے ہیں، چھری کو تیز کرتے ہیں اور پیشانی کے بل لٹا کر ذبح کرنے لگ جاتے ہیں۔ شاید ہی دنیا نے ایسا حیران کن منظر دیکھا ہو۔ اس خلوص وللّٰہیت نے رحمت خداوندی کو کتنا موجزن کیا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ فوراً خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے کہ اے ابراہیمؑ! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب بجائے بیٹے کے پاس کھڑے مینڈھے کو ذبح کیجئے، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون و گوشت کی قربانی نہیں تھی، روح و دل کی قربانی، ماسوا اللہ کی قربانی اور اپنے تمام جذبات، خواہشوں اور آرزوؤں کی قربانی تھی، اور جانور کی ظاہری قربانی اندرونی نقش کا ظاہری عکس۔ یہی وہ قربانی ہے جس کو ''ذبح عظیم'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ قربانی اللہ کے نزدیک ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار ہمیشہ کے لئے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی، اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو سارے عالم میں یہ شعار اسی طرح منایا جاتا ہے۔ اور حج کے موقع پر ادا کئے جانے والے ایک ایک عمل و حرکت سے قرآن کے اس دعوے کی صداقت ظاہر ہوتی ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں۔

ان وفا کیشان محبت خلوص شعاروں اور جاں نثاروں نے حقِّ بندگی کچھ اس طرح ادا کیا کہ آج ان

کا اسوہ عامۃ الناس کے لئے قابل اطاعت نمونۂ عمل بنادیا گیا ہے۔ یہ جاں سپاری وجاں نثاری ایسی ہے کہ جس پر قدسیانِ ملأ اعلیٰ تک رشک کرتے ہیں۔ اور یہی وہ متاع گرانمایہ ہے جو بنی نوع انسان کے لئے باعث صد افتخار اور مایۂ امتیاز بلکہ مابہ الامتیاز ہے۔ دراصل اسی ایثار نفسی اور جاں سپردگی میں وہ کیف وسرور، وہ سوز وگداز، وہ رمز وحلاوت ان مقربان الٰہی کو حاصل ہوتی ہے جو انھیں عرفانِ ذات اور خود آگہی عطا کردیتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے یہ سرشار عشق خداوندی ہوکر، شوق ومستی اور آرزومندی میں نغمہ زن ہوجاتے ہیں ؎

متاع بے بہاہے درد و سوزِ آرزومندی
مقام بندگی دے کرنہ لوں شان خداوندی

اللہ تعالیٰ ان انفاس قدسیہ کا صحیح اتباع نصیب فرما کر وہ ذوق وشوق، وہ ایثار نفسی، وہ جاں سپاسی، وہ خلوص ومحبت اور ایثار وقربانی کا وہ جذبۂ صادق ہمارے اندر بھی پیدا فرمادے۔ آمین!

☆☆☆

مولانا مفتی آصف انجم ملی ندوی

ترکہ کی شرعی تقسیم، ایک انتہائی اہم فریضہ

کوئی بھی مرد یا عورت اپنے انتقال کے وقت اپنی ملکیت میں جو مال وجائداد، نقد روپیہ، استعمال کے ساز وسامان، غرض کوئی بھی چھوٹی بڑی چیز چھوڑ جائے حتی کہ جسم پر جو کپڑا ہو یا جیب میں الائچی کا ایک دانہ ہی کیوں نہ ہو، سب اس کا ترکہ کہلاتا ہے، میت کے ترکہ کے بارے میں شریعت کا قانون یہ ہے کہ اس ترکہ سے متعلق وہ چار حقوق ادا کئے جائیں جن کا ترتیب وار ادا کرنا واجب ہے۔ سب سے پہلے خود میت کے کفن دفن کا مناسب اور درمیانہ خرچ کے ساتھ انتظام کیا جائے، چاہے اس میں سارا ترکہ لگ جائے۔ دوسرے اگر کفن دفن کے بعد کچھ ترکہ بچ گیا ہے (اور میت کے ذمہ کوئی قرض ہو تو) اس سے قرض ادا کیا جائے، چاہے قرض کی ادائیگی میں سب ترکہ ختم ہو جائے۔ تیسرے اگر قرض کی ادائیگی کے بعد بھی کچھ ترکہ بچ گیا تو یہ دیکھیں کہ میت نے کوئی وصیت تو نہیں کی ہے (اگر میت کی کوئی جائز وصیت غیر وارثین کے حق میں ہو تو) اس باقی ماندہ ترکہ کے تین حصے کر کے اس کے ایک تہائی (1/3) حصہ سے اس کی وصیت پوری کی جائے۔ چوتھے یہ کہ مذکورہ بالا تین حقوق کے ادا کرنے کے بعد اب جتنا ترکہ بچ گیا ہے اس کو میت کے وارثین کے درمیان شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کر کے ہر حق دار تک اس کا حق جلد از جلد پہنچا دیا جائے۔ مذکورہ بالا حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا، ترتیب کو باقی نہ رکھنا، قرض داروں، وصیت اور ترکہ کے حق دار وارثوں کو ان کا حق دینے میں تاخیر کرنا، اور حق داروں کی اجازت ورضامندی کے بغیر ترکہ کے سامان اور مال وجائداد پر قبضہ کئے رہنا، اس سے اپنا کاروبار کرتے ہوئے تنہا اس کا نفع حاصل کرتے رہنا، ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس مشترکہ مال وجائداد میں سے لوگوں کی دعوتیں کرنا اور اس سے کسی کو ہدیہ تحفہ وغیرہ دینا، وارثین کی اجازت کے بغیر اس ترکہ کے مال وجائداد میں سے کچھ بیچ دینا یا میت کے کپڑوں اور اس کے استعمال کی چیزوں کو صدقہ کر دینا، میت کے روپئے پیسے وارثین کی خوشدلی اور ان کی اجازت کے بغیر مسجد مدرسہ کے کسی کام میں خرچ کر دینا غرض ترکہ کی چیزوں میں کسی بھی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں ہے، جو لوگ ان حقوق کی

ادائیگی کی فکر نہیں کرتے اور ترکہ میں کسی بھی قسم کا تصرف کرتے رہتے ہیں وہ ایک طرف قانونِ شریعت اور احکامِ الٰہی کی کھلی مخالفت کرتے ہیں اور دوسری طرف بندوں کے، بالخصوص بھائی بہنوں اور ماں باپ کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وارثین میں یتیم بچے بھی شامل ہوتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ یتیم، مجنون اور نابالغ بچے اگر کسی کو اپنا مال خوشی سے ہدیہ تحفہ میں دیں، یا کسی کو خوشدلی و رضامندی کے ساتھ ہی سہی اپنی کوئی چیز استعمال کرنے کی اجازت دے دیں تب بھی اس کا لینا اور اس چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ یتیم کا مال ناحق کھانا، ان کے حصوں سے فائدہ اٹھانا اور انھیں نفع سے محروم رکھنا بہت بڑا جرم ہے، قرآن کریم میں اس جرم کی سزا یہ بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال بے مصرف خرچ کرتے ہیں یا خود ہی ناحق ہڑپ کر جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ ترکہ کے متعلق شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ انسان کے انتقال کے بعد اس کا ترکہ اس کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور اس کے کفن دفن کے بعد اس ترکہ میں قرض خواہوں کا پھر ان لوگوں کا جن کے بارے میں مرنے والے نے وصیت کی ہے اور سب سے آخر میں مرنے والے کے وارثین کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے اب اگر ان حقوق کو ادا نہ کیا گیا ہو اور ترکہ کے مال و اسباب پر قبضہ کر کے اس سے کوئی تجارت یا کاروبار کرتا رہے تو تمام حقدار اس کاروبار میں شراکت دار (پارٹنر) کی حیثیت سے کاروبار کرنے والے کے شریک ہوں گے، لہٰذا اس تجارت میں جو بھی نفع ہوگا وہ تمام حقدار متعلقین کے درمیان ہر ایک کے حق اور حصہ کے بقدر تقسیم کرنا واجب ہوگا۔

قانونِ میراث اور تقسیمِ ترکہ کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۂ نساء میں اس مسئلہ سے متعلق تفصیل کے ساتھ احکام نازل فرمائے ہیں اور ہر وارث کا حق مقرر فرمانے کے بعد رکوع کے آخر میں خوفناک وعید بھی بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (ترجمہ) یہ سب (قانونِ وراثت واحکامِ وصیت) خداوندی ضابطے ہیں، جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی (اس قانونِ وراثت کی پابندی کے ساتھ پوری) اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے (بہشت کے ایسے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کی حد سے باہر نکل جائے گا اسے اللہ تعالیٰ (دوزخ کی) آگ میں داخل کرے گا، اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا اور اسے ذلت دینے والا عذاب ہوگا۔ (سورۂ نساء، آیت ۱۳ و ۱۴) اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بعض مفسرین کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''یہ ایک بہت بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے

عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں، یا ان قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کردی ہیں۔لیکن افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی بہت مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا، اس قانون وراثت کے معاملے میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا، کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھہرایا گیا۔کہیں سرے سے تقسیمِ میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ''مشترک خاندانی جائداد'' کا طریقہ اختیار کرلیا گیا، کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کردیا گیا۔''ان قدیم بغاوتوں کے علاوہ کتنی ہی نئی نئی بغاوتوں کا مشاہدہ آج ہم اپنے معاشرے میں بھی کرسکتے ہیں، سب سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ اب باہمی حقوق کی ادائیگی اور معاملات کے اس نازک ترین شعبے میں شفافیت وصفائی کا خیال واہتمام دیندار سمجھے جانے والے گھرانوں سے بھی رخصت ہوتا جارہا ہے، اور یہ ایک مسلم معاشرے کے حق میں نہایت تباہ کن اور تشویشناک صورت حال ہے ۔ہر مسلمان کو اس مسئلہ میں بہت زیادہ حساس اور چوکنا رہنا چاہئے، غفلت وسستی اور ٹال مٹول کی عادت سے باز آنا چاہئے اور ترکہ کی جلد از جلد تقسیم کرکے ظلم اور کبیرہ گناہ سے باز آنا چاہئے۔

☆☆☆

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی برپا کردہ تبلیغی محنت کا اصل مزاج کیا تھا؟

تو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ محترم جناب قطب الدین ملا صاحب کی تازہ تصنیف

تزکیہ واحسان اور اکابر تبلیغ

کا ضرور اور بغور مطالعہ کریں۔

اس کتاب کے مضامین کے چند اہم عنوانات یہ ہیں:

دعوت وتبلیغ کا کام مدرسوں کا مخالف نہیں	دعوت وتبلیغ کا کام تصوف کا بھی مخالف نہیں
حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور سلوک وطریقت	مولانا محمد الیاسؒ کا شیخ الحدیثؒ کو بیعت کا حکم
دعوت وتبلیغ اور علم وذکر کا ربط وتعلق	علم وذکر کے بغیر یہ تحریک سراسر مادیت ہے
اپنے مریدوں کو حضرت مولانا محمد الیاس کا ذکر تلقین کرنا	ذکر، مشائخ کی نگرانی میں ہو
خانقاہی نظام سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا تعلق	حضرت مولانا یوسفؒ کا طریقۂ بیعت
بیعت وطریقت کے متعلق حضرت مولانا محمد انعام الحسنؒ کے بصیرت افروز خیالات	سلوک واحسان کے بارے میں آپ کے مکتوبات
بنگلہ والی مسجد، مرکز تبلیغ میں ذکرِ جہر اور مجلس ذکر	حضرت تھانوی کے لوگوں سے اور ان کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے
عوام کو علماء سے جوڑنا ہمارا مقصد ہے	دین کے تمام حلقوں میں یگانگت پیدا کرنا ہمارا اہم مقصد ہے
بنگلہ والی مسجد، اب بھی امیدوں کا مرکز	

ملنے کا پتہ: الفرقان بک ڈپو، 114/31، نظیر آباد، لکھنؤ 226018

قیمت -/50 روپئے (ڈاک خرچ بذمہ خریدار)